قرات کی علامات کی تشریح کیلئے ایک مستقل خانہ ہے، ۹ پائی محصول ڈاک بھیجکر مفت منگا سکتے ہیں،

اسلامی تاریخ کی سچی کہانیاں، مرتبہ مولوی محمد حسین صاحب محوی لکھنوی، ضخامت ۵۱ صفحات، تقطیع چھوٹی، قیمت ۱۔ ۳ مکتبہ جامعہ دہلی،

اسمیں اسلامی تاریخ اور اکابر اسلام کے مختصر واقعات بچون کیلئے دلنشین پیرایہ میں لکھے گئے ہیں،

تعلیمی کھیل، از جناب محمد عبد الغفار صاحب مدھولی، ۸۴ صفحات، تقطیع چھوٹی، قیمت ۶ر، مکتبہ جامعہ دہلی،

اس رسالہ میں کھیل کود ہی میں بچوں کو تعلیم کی کارآمد باتیں سکھانے کے طریقے بتائے گئے ہیں،

استانی کی کہانیاں، اخلاقی کہانیاں، دادا کی موت، گھر کی حکومت، حیوان نما انسان، پاؤں کے نیچے جنت، از جناب میاں سلطان احمد وجودی، قیمت بترتیب ۲ر، ۲ر، ۱ر، ۱ر، ۱ر، ۱ر، پتہ منیجر صاحب نظامیہ بک ڈپو، بٹالہ، (پنجاب)

یہ چھوٹے چھوٹے افسانے ہیں، جو اخلاقی و معاشرتی اصلاح کے لئے لکھے گئے ہیں، بعض رسالوں میں بچوں کے لئے متعدد چھوٹے چھوٹے قصے ہیں،

تحریف بائبل، از مولوی محمد ابراہیم صاحب مسلم مشنری الہ آبادی، نمبر ۱۰ نخاس کہنہ الہ آباد، ۱۹ صفحات قیمت ۱ر

یہ ایک مختصر کارآمد رسالہ ہے، اس میں انجیل کی تحریفات پر یورپ کے اکابر کے اقوال اور موجودہ انجیلوں کے اختلافات اقتباسات کے ذریعہ دکھائے گئے ہیں، مناظرات سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے یہ رسالہ دلچسپ ثابت ہوگا،

بچوں کی نظمیں، از جناب سعید انصاری صاحب بی اے (جامعہ) ۶۲ صفحات تقطیع چھوٹی قیمت ۵ر مکتبہ جامعہ دہلی،

اسمیں چھوٹے بچوں کیلئے سہل اور پر اثر نظمیں جمع کی گئی ہیں، آخر میں مشکل اور نامانوس الفاظ کا فرہنگ درج ہے،

حسن القرآن فی تجوید القرآن، از مولوی قاری محمد حسن صاحب ۳۲ صفحے ۲ر پتہ قاری احمد حسن صاحب مہتمم مدرسہ احمدیہ، کوٹھی میم واقع باڑہ ہندو راؤ، دہلی،

اس رسالہ میں فن تجوید کے قواعد سہل زبان میں بچوں کیلئے لکھے گئے ہیں،

"ض"

جلد ۳۵ | ماہ ذیقعدہ ۱۳۵۳ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۳۵ء | عدد ۳

مضامین

شذرات

مسلمانوں کی گذشتہ سیاسی جد وجہد کی صحیح یادگار گو بالواسطہ سہی، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ہی ہے، مگر یہ خود مسلمانوں کے جدید تعلیمی و ذہنی انقلاب کا مظہر ہے، جو خود جدید تعلیم یافتہ اشخاص کے ہاتھوں ہو رہا ہے، ہم اس کے ذریعہ اس ذہنیت کو بدلنا چاہتے ہیں جو انگریزی حکومت کیساتھ مسلمانوں کے اندر بلکہ ہندوستانیوں کے اندر پیدا ہوگئی ہے کہ تعلیم کا مقصد سرکاری ملازمت ہے، حالانکہ تعلیم کا اگر کوئی دنیاوی نصب العین ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ کہ ایک بہتر کاروباری آدمی پیدا ہو، ہم نے "مسلمانوں کی آیندہ تعلیم" میں جو اب جامعہ کی طرف سے مستقل رسالہ کی صورت میں شائع ہو چکا ہے[1]، اس کی پوری پوری حقیقت ظاہر کردی ہے،

جامعہ کی ابتدا کس بے سروسامانی اور کس مپرسی کیساتھ ہوئی، بارہا وہ وقت آیا جب اسکی زندگی کی کشتی بھنور میں پھنس پھنس کر نکلی ہے، اور آخر اس کے کارکنوں کی ان تھک کوششوں کی بدولت وہ دن آیا کہ یکم مارچ ۳۵ء کو اسکی عمارت کا سنگ بنیاد ایک معصوم بچہ کے ہاتھوں سے رکھا گیا، اہل جامعہ نے اس عمارت کی تعمیر و تکمیل کیلئے ڈھائی لاکھ کی اپیل کی ہے، اور خوشی کی بات ہے کہ اسکے جلسۂ سنگ بنیاد تک ۳۲ ہزار چندہ ہوگیا،

ہم نے اس خیال کو بارہا ظاہر کیا ہے،

بارہا گفتہ ام و بارِ دگر می گویم،

مسلمانوں کے سامنے بغیر کافی تیاری کے کوئی عام تحریک پیش نہ کیجائے، اور اگر پیش کیجائے تو اہل تحریک کا فرض ہے کہ اسکو جس طرح بنے مسلمانوں سے پورا کرائیں، تاکہ انکی اخلاقی قوت روز بروز بڑھے، اور کسی کام کو ناتمام چھوڑ

[1] قیمت ۸؍ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی اور دار المصنفین اعظم گڈھ سے یہ رسالہ مل سکتا ہے،

ان کے پورا کرنے کا جذبہ ان میں پیدا ہو، یہ ڈھائی لاکھ کی رقم کچھ زیادہ نہیں اہل ثروت کو بھی تکلیف فرمانے کی ضرورت نہیں، یہ صرف غریبوں کے پیسوں سے پوری ہو سکتی ہے، اس کے لیے صرف عزم اسلامی چاہیے،

وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ،

مدراس کا خطہ ملیبار جس کو کیرلا کہتے ہیں، پرانے عرب خاندانوں سے آباد ہے، اور عرب و ہند کے بحری و تجارتی تعلقات کی یادگار ہے، جنگ عظیم کے بعد وہاں جو شورش برپا ہوئی، اس نے گو وہاں کے مسلمانوں کو سخت جانی و مالی نقصانات پہنچائے، تاہم اس سے اتنی بھلائی ضرور پیدا ہوئی کہ اس نے ان کو جھنجھوڑ کر سوتے سے جگا دیا، اور اب انکو اپنی حالت کا احساس ہوا، ان میں تعلیم کی بیداری ہوئی، مذہبی اصلاحات کا خیال ہوا، ان کے علما نے اپنی جمعیت قائم کی جسکا نام کیرلا جمعیۃ العلما رکالی کٹ ہے،

جمعیت اپنے کاموں کے حلقہ کو وسیع کر رہی ہے، اور مسلم لٹریچر سوسائٹی کی بنیاد ڈال کر قرآن پاک اور صحیح بخاری کا ملیباری (ملیالم) میں ترجمہ کرا رہی ہے، اور اسی کی طرف سے قرآن پاک کی کوئی مفید تفسیر اس زبان میں شائع کرنا چاہتی ہے، اور مسلمانوں میں مذہبی اصلاحات کو فروغ دینے کے لئے ایک ماہوار رسالہ المرشد کی اشاعت کا بندوبست شروع کر دیا ہے، ملیباری مسلمانوں سے امید ہے کہ وہ جمعیت کے ان مفید کاموں میں اسکا ہاتھ بٹائیں گے،

ہمارے اردو رسالوں کی برادری میں شاید زمانہ کانپور سے زیادہ عمر رسیدہ کوئی دوسرا نہ ہو، یہ چونتیس برس منشی دیانرائن نگم کی اڈیٹری میں یکساں آب و تاب سے نکل رہا ہے، اردو ادب کا یہ دیرینہ خادم ہماری ہر طرح کی امداد کا مستحق ہے، آج ہمارے ملک میں صرف ہندو پانی اور مسلمان پانی کا فرق نہیں ہے، بلکہ انتہا یہ ہے کہ ادبیات میں بھی ہندو رسالہ اور مسلمان رسالہ کا فرق نمایاں ہو گیا ہے، ایسی حالت میں تنہا زمانہ ہی ایک ایسا رسالہ ہے جس کے صفحات میں ہندو مسلمان دونوں قوموں کے ادیب اور اہل قلم دوش بدوش ملتے ہیں،

سیرۃ النبی جلد چہارم کا دوسرا چھوٹا اڈیشن چھپکر تیار ہو گیا، چونکہ تقطیع کتابی کردی گئی ہے اسلئے نو سو صفحوں کی ضخامت ہوگئی ہے جسکو اگر کوئی چاہے تو دو برابر جلدوں میں تقسیم کرکے مجلد کرا سکتا ہے، اس غرض کیلئے بیچ میں دوسرا ٹائٹل بھی

رکھدیا گیا ہے، اس جلد کی قیمت قسم اول کی عہ اور قسم دوم کی ۵ر مقرر ہوئی ہے، جن لوگوں نے اسکی چھوٹی تقطیع کے اڈیشن میں اب تک اس کو نہیں خریدا، امید ہے کہ اب اسکو خرید کر مطالعہ فرمائیں گے،

اسی کے ساتھ اس اعلان میں بھی ہم کو مسرت ہے کہ سیرۃ النبیؐ کی پانچویں جلد جو عبادات و اخلاق پر ہے مطبع میں دیدی گئی ہے، سو صفحوں کے قریب اس کی کتابت ہو چکی ہے، اور پہلا جزو رقہ چھپ رہا ہے، اگر درمیان میں کوئی ناممکن پیش نہ آئی تو امید ہے کہ سنہ ۱۹۳۶ء میں وہ چھپ کر تیار ہو جائیگی،

موجودہ کساد بازاری میں شائقین پر دارالمصنفین کی کتابوں کی پرانی قیمتیں بار ہو رہی تھیں، اس مشکل کو پیش نظر رکھکر اس نے اپنی مطبوعات کی پرانی قیمتوں میں مناسب کمی کردی ہے، اخباروں میں بھی اسکے اعلانات نکل رہے ہیں، نئی فہرست بھی تیار ہو گئی ہے، جو صاحب چاہیں یہ فہرست منگا سکتے ہیں،

لاہور کی مجلس ادارۂ معارف اسلامیہ جسکا پہلا اجلاس دو سال ہوئے اپریل سنہ ۱۹۳۳ء میں ہوا تھا اب آیندہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۵ء میں اپنا دوسرا اجلاس لاہور میں منعقد کریگی، اسکا مقصد اسلامی علوم و فنون و تمدن کی تحقیق ہے، وقت ہے کہ مسلمان علمائے تحقیق مختلف اسلامی مسائل و مباحث پر محققانہ مقالات لکھکر اس میں پیش کریں، یورپ میں اور خود ہندوستان میں اس قسم کی مجلسیں نہایت خوبی سے اپنا کام کر رہی ہیں، مسلمان اہل تحقیق کو بھی گرمجوشی اور مستعدی سے اس قسم کے خدمات بجالانے کی ضرورت ہے، گذشتہ اجلاس کے مقالات کا مجموعہ مع روداد عنقریب شائع ہوگا، اس سلسلہ میں پروفیسر محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی اورینٹل کالج لاہور سے مراجعت کیجائے،

ریاست بڑودہ کے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ہندی کی انجمنوں اور مجلسوں کی فہرست مع مختصر حالات اور نقشوں کے شائع ہوئی ہے، جسکا مقصد ہز ہائنس مہاراجہ بڑودہ کی اس خواہش کی کہ ہندوستان میں اس عام و مشترک زبان کی اشاعت کی ایک مختصر روداد مرتب کیجائے تکمیل ہے، اس روداد کی بنا پر بہار و اڑیسہ میں ۹ پنجاب میں ۱۳ صوبہائے متحدہ میں ۸ بمبئی میں ۲ بنگال و آسام میں ۱۴ مدراس میں ۲۰ سنٹرل انڈیا میں ۱۳ اجمیر راجپوتانہ میں ۱۱ میسور میں ایک اور صوبہائے متوسط میں دو سبھائیں قائم ہیں، اس سلسلہ میں دارالمصنفین کا نام دیکھکر تعجب ہوا،

مقالات

عربوں کی بحری تصنیفات

عرب جہازرانوں کے پاس ستاروں کی شناخت، ہواؤں کی دریافت، اور ملکوں اور جزیروں کی واقفیت اور سواحل کے طول و عرض بلد کا علم سفینوں سے زیادہ سینوں میں محفوظ رہتا تھا، اور غالباً یہ علم موروثی ہوتا تھا، جو باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتا تھا، لیکن اس کے باوجود ہر جہازراں کے پاس سمندروں کا اور ان کے ساحلی شہروں اور جزیروں کا ایک نقشہ ہوتا تھا جسکو بحر روم والے کمپاس[1]، اور خلیج فارس اور بحر ہند والے رہبان اور اسکو عربی میں نگار ڈکر رہمانی کہتے تھے[2]، اسی قسم کے رہنماؤں کی تالیف و تدوین سے اس فن کی کتابوں کا آغاز ہوا، ابن ماجد نے لیث بن کہلان کے ہاتھ کا ایک راہنامہ جس پر سنہ ۵۸۰ھ لکھا ہوا تھا، دیکھا تھا، حضرت علیؓ کی طرف ایک مثنوی (ارجوزہ) منسوب ہے جسمیں منازل فلکی اور ستاروں کے اشکال نظم کئے گئے ہیں، (ص ۱۶۳ پیرس)

اس قسم کے راہناموں کے دو اور مؤلف محمد بن شاذان اور سہل ابان تھے، ان کا آغاز انا فتحنا لک فتحا مبینا کی متبرک آیت سے کیا گیا تھا، لیکن نہ اسمیں اشعار تھے، اور نہ ہر مقام کا ستاروں کے ذریعہ سے اندازہ تھا، اس قسم کی صرف ایک کتاب ابن ماجد کو ملی تھی، مگر اوس کا اول و آخر نہ تھا، اور نہ اس کے معلومات صحیح تھے[4]، ابن ماجد نے اپنی کتاب الفوائد میں محمد بن شاذان کی تصانیف کا نام دو تین مقاموں پر لیا ہے[5]، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکی کتابوں کی اس باب میں کچھ اہمیت حاصل تھی، لیث بن کہلان، محمد بن شاذان[6] اور سہل بن ابان کی کتاب کا ذکر

[1] مقدمہ ابن خلدون جغرافیہ مصر، [2] الفوائد ص ۲، [3] الفوائد ابن ماجد ص ۳، [4] الفوائد ص ۳، [5] الفوائد ص ۱۲ و ص ۳۱،

ابن ماجد نے حاویۃ الاختصار کے ان شعروں میں بھی کیا ہے،[1]

ونظم تالیف ابن تجلان وسھل واللیث بن ابان

ذوی النہی ومصلحین الشان زخرف ربی لھم الجنان

اس قسم کے اشعار میں عرب ماخذوں کے بعض معلومات نظم کر دیے تھے، جنکو جہاز راں یاد کر لیتے تھے، اور

یہ سرمایہ ایک سے دوسرے کو منتقل ہوتا رہتا تھا،[2]

بزرگ بن شہریار ناخدا کی تصنیف عجائب الہند جو چوتھی صدی کے سرے پر لکھی گئی ہے، جہاز رانوں کے

صرف حکایات و مشاہدات پر مشتمل ہے، البتہ مسعودی کے بیانات جو اسی زمانہ میں اوس نے مروج الذہب کے مقد

میں مرتب کئے ہیں، وہ بہت حد تک محققانہ ہیں، ایک جہاز راں احمد بن تیرویہ نے جو چوتھی صدی میں غالباً تھا

اس فن پر کچھ کتابیں لکھی تھیں، خواشر بن یوسف بن صلاح الارکی کی بھی کوئی کتاب تھی،[3] یہ چوتھی صدی میں ہندو ستان

تک آتا تھا لیکن فن کی حیثیت سے اس پر محمد بن عمراد اسکے بیٹے ماجد بن محمد بن عمر نے غالباً آٹھویں صدی کے آخر اور نویں صدی کے وسط میں

بحر قلزم اور بحر عرب پر ایک دو رسالے اور منظومے لکھے تھے، ماجد بن محمد بحر قلزم کا بڑا ماہر جہاز راں تھا، جہازی اسکو

ربان البرین کہتے تھے، اوس کے ایک منظوم رسالہ کا نام حجازیہ ہے، جس میں ہزار شعر تھے،[4] ماجد کے بیٹے احمد بن ماجد

نے نویں صدی اور سلیمان مہری نے دسویں صدی کے وسط میں بکثرت کتابیں اور رسالے لکھے، ان دونوں کی کتا

پیرس کے قومی کتبخانہ میں تھیں، جنکو ۱۹۲۱ء میں عکس لیکر مع ایک فرنچ ضمیمہ کے تین جلدوں میں شائع کیا گیا ہے،

اس فن کا سب سے پہلا مدون اسد البحر شہاب الدین احمد بن ماجد بن محمد بن عمر بن فضل بن دویک بن یوسف

بن حسن بن حسین بن ابی معلق سعدی بن ابی البرکات نجدی ہے، جہاز رانی اس کا موروثی پیشہ تھا، اس نے اپنی کتاب

الفوائد فی اصول علم البحر والقواعد ۸۹۵ھ[5] میں پچاس برس کے تجربہ کے بعد[6] لکھی ہے، اس فن میں اسکے نظم و نثر رسائل

[1] الفوائد ص ۹۰، [2] العمدۃ المہریہ سلیمان مہری ص ۱۱، [3] الفوائد ص ۴، [4] الفوائد ص ۷۵، [5] آخر الفوائد،

[6] الفوائد ص ۸۴، [7] الفوائد ص ۸۰،

اور تصنیفات کی تعداد ۲۵ ہے، جنکی تفصیل حسب ذیل ہے،

شمار	کتاب کا نام	مضامین
۱	الفوائد فی اصول علم البحر والقواعد،	یہ کتاب بارہ فائدوں پر مشتمل ہے، پہلا فائدہ چاند کی منزلوں اور برجوں کی تقسیم میں، دوسرا جہازوں کے ضروری معلومات و صفات میں، تیسرا ستاروں کی مشہور شکلوں میں، چوتھا مناز ل قمر اور خانوں[1] میں، پانچواں ریاضی و فلکی علوم کی ضرورت میں، چھٹا دیرہ میں، ساتواں ہواؤں میں آٹھواں جہاز کے انتظامات اور سمندروں کے سواحل میں، نواں ستاروں سے ملکوں کی شناخت اور تین قسم کے جہاز رانوں کے بیان میں، دسواں مشہور جزیروں میں، یعنی جزیرہ عرب، جزیرۃ القمر، جس کا دوسرا نام مڈگاسکر ہے، سوماترہ، جاوہ، غور، سیلون، زنجبار، بحرین، جزیرہ ابن جاوان، اور سقوطرہ، گیارہواں موسموں میں، بارہواں بحر احمر کی شاخوں اور جزیروں میں،
		مصنف نے اس کتاب میں جا بجا قطب نما کا حوالہ دیا ہے
۲	حاویۃ الاختصار فی اصول علم البحار،	یہ کتاب رجز یعنی منظوم مثنوی ہے، اسمیں گیارہ فصلیں ہیں، پہلی میں ان اشارات کا ذکر ہے جنکی ضرورت جہاز رانوں کو ہے، دوسری میں منزلوں اور خانوں کا

[1] دائرۂ افقیہ کے ۳۲ حصوں میں سے ہر حصہ کو خن (خانہ) کہتے ہیں، العمدۃ المہریہ سلیمان مہری ص ۱۲

شمار	کتاب کا نام	مضامین
		بیان، تیسری مختلف قوموں کی جنتریوں میں چوتھی بعض ستاروں میں، پانچویں عرب، حجاز، سیام، افریقہ، خلیج بربر، سومال، اور جزائر قمر، (مدگاسکر) کے تعین میں، چھٹی عجم، ہندوستان، بنگالہ، سیام، جزیرہ مہراج اور چین میں، ساتویں سوماترہ، مدگاسکر، یمن سواحل عرب، سومال، مکران میں، آٹھویں عرب کی خشکی سے ہندوستان کی خشکی تک کے حسابات میں، نویں بحر ہند کے سواحل میں، دسویں اس بحر محیط کے بہاؤ کے بیان میں جو ہندوستان چین اور افریقہ کے بیچ میں ہے، گیارہویں اس تقویم میں جس سے شب و روز کے اوقات کا شمار اور طوفانوں کی آمد کا حساب معلوم ہو،
۳	ارجوزۃ (مثنوی) المعربیہ	خلیج بربر سے باب الہند (المندب) ملک عرب اور زیلع (واقع افریقہ) کا قیاس،
۴	القبلہ فی الاسلام فی جمیع الدنیا	دنیا کے ہر حصہ اور سمندر سے قبلہ کی تعیین کا طریقہ، مصنف اس علم میں تکمیل کی اولیت کا دعوی کرتا ہے،
۵	ارجوزۃ بر العرب	خلیج فارس تک عرب،
۶	ارجوزۃ فی قسمۃ الجمہ علی انجم بنات نعش،	بنات النعش کے ستاروں میں،

شمار	کتاب کا نام	مضامین
۷	کنز المعالمہ	سمندر کے نامعلوم امور اور ستاروں اور برجوں اور ان کے ناموں میں بر ہند اور بر عرب میں،
۸	ارجوزۃ،	
۹	ارجوزہ میمیہ،	
۱۰	ارجوزہ مخمسہ،	
۱۱	ارجوزۃ،	رومی مہینوں کے شمار میں
۱۲	ارجوزہ ضریبۃ الضرائب	
۱۳	قصیدہ مکیہ،	مکہ سے جدہ، قرنک، کالیکٹ، دیبل، (سندھ) کوکن، گجرات، اور ہرمز تک،
۱۴	نادرۃ الابدال	
۱۵	ذہبیہ،	بعض آلات کے بیان میں،
۱۶		دس متفرق رسائل، متفرق بحری و فلکی مباحث میں،

سلیمان مہری دسویں صدی کے شروع میں تھا، اس نے پہلے رسالہ علم التواریخ کے مقدمہ میں سنہ ۹۱۷ھ کا حساب لگایا ہے، اور اسکی کتاب العمدۃ المہریہ ۹۱۷ھ کی تالیف ہے، تصانیف کی فہرست یہ ہے،

شمار	کتاب کا نام	مضامین
۱	قلادۃ الشموس فی علم التواریخ	مختلف قوموں کی جنتریوں اور سالناموں کی تشریح
۲	تحفۃ الفحول فی تمہید الاصول	جہازرانوں کے بعض اصطلاحات کی تشریح، بحر خلیج فارس، بحر عرب، اور بحر ہند کے ایک جزیرہ اور بندر کا

شمار	کتاب کا نام،	مضامین،
		تعین ستارون کی سمت اور سیدھ سے، اس کتاب میں گ گجرات اور سندھ کے بندرگاہون کے ساتھ بنگالہ اور ایک بندرگاہ چاٹگام (شاتی جام) کا نام بکثرت آتا ہے، ابن ماجد کے یہان بنگالہ (بنجالہ) کے بجائے بنگ (بنج) نام آیا ہے،
۳	العمدۃ المہریہ فی ضبط العلوم البحریہ	یہ سلیمان کی سب سے بہتر تصنیف ہے، کتاب سات باب پر منقسم ہے، پہلا باب جہازرانوں کی اصطلاحات اور فلکی معلومات پر ہے، دوسرا ستاروں کے نامون، اور قطب شمالی، جاہ، فرقدین کو دیکھکر آنکھوں پر انگلیوں کو رکھکر مسافت دریافت کرنے میں، تیسرا نجم، جزائر عجم، بر عرب، زیلع، سومال، سیام، چین اور ماچین کی سیدھ کی دریافت میں، چوتھا جزیرۂ قمر، (مڈگاسکر) جزیرۂ ذریں، جزیرہ سقوطری، جزیرہ فال، جزیرۂ دیپ، جزیرہ سیلون جزیرۂ انڈمان، جزیرۂ ناگ باری، جزائر سیام، جزیرۂ سوماٹرا، جزیرۂ جاوہ، اور جنوبی مشرقی جزیروں کے پہچانے میں، پانچوان عرب وعجم وہند، اور جزائر کے راستون میں، چھٹا موسموں کی شناخت میں، ساتواں بحر فارس اور بحر عرب کے جزیروں میں، اور حسب ذیل بندرگاہون

شمار	کتاب کا نام،	مضامین
		سے دوسرے بندرگاہون تک سفر میں،
		باب المندب سے کوہ زقرا اور سیبان تک
		سیبان ״ جدہ ״
		سیبان ״ سواکن ״
		سواکن ״ عدن ״
		زیلع (اریتیریا) ״ گجرات ״
		عدن ״ ״ ״
		بربرہ ״ ״ ״
		کش ״ ״ ״
		خلفات ״ ״ ״
		ظفار (یمن) ״ ״ ״
		کلہاٹ ״ ״ ״
		عدن ״ نیبار (ملیبار) ״
		عدن ״ ہرمز ״
		دیو ״ مشقاص ״
		دیو ״ شحر اور عدن ״
		مہایم (ماہم) اور چیول ״ ساحل عرب ״
		دیو ״ دیپ ״
		دیبل (سندھ) ״ دیپ ״

شمار	کتاب کا نام	مضامین
		دیو سے مسکت (مسقط) تک
		کھمبایت (کاٹھیاواڑ) " عدن "
		دیپل (سندھ) " عدن "
		سندر پور سے عدن "
		ہنور اور باد قلا " عدن "
		کالیکٹ " گروفن
		دیو " ملاگا
		دیو " بنگالہ یعنی چاٹگام
		ملاگا " عدن
		چاٹگام " ساحلِ عرب
		خاتمہ، چند ہدایات،
۴	المنہاج الفاخر فی علم البحر الزاخر	اس کتاب میں ایک مقدمہ چھ باب، اور خاتمہ ہیں، مقدمہ مصنف کے اختیار کردہ فلکی ونجومی اصول کی دریافت میں، پہلا باب ان مشہور سمندروں کی سیدھ کے جاننے میں، جو جزیروں سے آباد ہیں، دوسرا قیاسات میں تیسرا جزیروں کی شناخت میں، چوتھا جاہ اور فرقدین کے قیاس پر مسافت دریافت کرنے میں، چھٹا خشکیوں کی [illegible] میں، ساتواں، بروج اور منازل میں آفتاب اور [illegible]

شمار	کتاب کا نام	مضامین
		کے داخل ہونے میں،
		خاتمہ بعض بندرگاہوں کے سفر میں،

سلیمان کی دو کتابیں العمدۃ المہریہ فی ضبط العلوم البحریہ اور المنہاج الفاخر فی علم البحر الزاخر کا ایک عمدہ قلمی نسخہ [illegible]ھ کا لکھا ہوا، اسلامیہ کالج پشاور کے کتبخانہ میں ہے، کتب خانہ کی مطبوعہ فہرست کے ص ۱۱۳ میں نمبر ۹۳۵ پر اس نسخہ کا ذکر ہے، تحفۃ الفحول کا نام چلپی کی کشف الظنون میں بھی ہے[1]

ابن ماجد اور سلیمان کی تصنیفات سے عربوں کے علاوہ ترک اور ہندوستانی جہازرانوں نے بھی فائدہ اوٹھایا، ترکی امیر البحر سیدی علی نے جو بہادر شاہ گجراتی اور ہمایوں کے زمانہ میں ترکی بیڑہ کو بحر ہند میں اور گجرات کے سواحل پر پرتگالی جہازوں سے لڑنے کیلئے لایا تھا محیط کے نام سے ترکی جہازرانی کے فن پر ایک محققانہ کتاب لکھی ہے، اسمیں ابن ماجد اور سلیمان مہری کی تصانیف سے پورا فائدہ اٹھایا ہے اور اوس کے مقدمہ میں ان دونوں کی پوری تعریف و توصیف کی ہے[2]

جامع مسجد بمبئی کے کتبخانہ میں اس فن پر سندھی زبان میں دو کتابیں ہیں، پہلی جو کسی عربی کتاب کی شرح ہے، شروع سے کچھ ناقص ہے، جابجا عربی فقرے اور عنوانات ہیں، مثلاً معرفۃ ابعاد الکواکب المشہورۃ عند الجمہور، بعد الجاہ عن نقطۃ الکرۃ سبع وثمانون درجہ کہیں کہیں فارسی بھی ہے، ہر عنوان معرفت کے لفظ سے شروع ہوتا ہے، اور سرخی سے لکھا ہوا ہے، ایک جگہ معلم سلیمان کا نام بھی آیا ہے صحیح قول معلم سلیمان، اس کتاب میں جزیروں کے نام اور مقامات کے فاصلے درج ہیں، قرینہ سے

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں شہاب الدین (ابن ماجد) اور سلیمان المہری کے مقالات میں ان دونوں معلموں کے مختصر حالات اور ان کی کتابوں پر پورا تبصرہ موجود ہے، [2] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مقالہ شہاب الدین،

یہ کتاب سنہ ۱۰۸۳ھ کی تالیف معلوم ہوتی ہے،

دوسری کتاب سندھی اور فارسی میں مخلوط ہے، یہ مکمل اور مفصل ہے یہ نسخہ بارہویں صدی ہجری کے ایک مسلمان جہازران معلّم عنایت بن معلّم شیخ داکو کے قلم کا لکھا ہوا ہے، نسخہ کے آخر میں ہے "کاتبہ و مالکہ فقیر الحقیر پر تقصیر معلّم عنایت بن معلّم شیخ داکو، در جزیرہ بمبئی ماہ رجب سنہ" سنہ نہیں لکھا ہے، مگر اندرونی شہادت سے سنہ ۱۱۹۲ھ معلوم ہوتا ہے، درمیان میں کچھ روزنامچہ بھی لکھا ہوا ہے،

اسی قسم کی ایک گجراتی یا کوکنی زبان کی کتاب کا ذکر مجھ سے سنہ ۱۹۳۰ء میں جناب یوسف کھٹکھٹے صاحب بی اے (بمبئی) نے کیا تھا، جو ان کی ملکیت میں تھا، مگر افسوس ہے، کہ انکی وفات کے بعد مجھے اس کتاب کا پتہ نہیں چلا،

یہ کل تصنیفات خلیج فارس سے لیکر ہندوستان اور چین تک کے سواحل اور جزیروں سے متعلق ہیں

بحر روم میں جہازرانی کے عنوان سے سب سے مشہور کتاب بحریہ ہے، جو ترکی میں لکھی گئی ہے، اور جس کا مصنف مشہور ترکی امیر البحر پیری بن حاجی محمد مقتول ۹۶۲ھ ہے، اوس نے اس میں بحر روم (بحر متوسط و [illegible]) کے حالات اور اس کے جزیروں، راستوں اور بندرگاہوں کو مع نقشوں کے منضبط کیا ہے، سنہ ۹۳۰ھ میں اوس نے یہ کتاب لکھکر سلطان سلیمان اول کی خدمت میں پیش کی، اسکے شروع میں دنیا کے نقشوں اور بحر ہند کے ملاحوں کے اصول و قواعد کا ذکر کیا ہے، [1]

[1] کشف الظنون چلپی، نام "بحریہ"

رسول صلعم

قرآن کی روشنی میں

از چودھری غلام احمد صاحب پرویز، بی آئی، دہلی

"حدیث کی دینی حیثیت کیا ہے،؟"

اگرچہ یہ مسئلہ بھی مسلمانوں میں کچھ اتنے ہی عرصہ سے محلِ نظر ہے، جتنے عرصہ سے اور اختلافی مسائل متنازعہ فیہ ہیں، لیکن مداولتِ ایام کی طرح انسانی خیالات میں بھی مد و جزر کا سلسلہ رہتا ہے، اور خاص خاص حالات کے ماتحت بعض وقت بعض مسائل خاص طور پر توجہات کا مرکز بنجاتے ہیں، چنانچہ پندرہ بیس سال ادھر جب سے پنجاب کی زرخیز زمین ایک نئے فرقہ کی تخلیق کا موجب بنی ہے، جسکے نزدیک احادیث کیلئے دین میں کوئی گنجائش نہیں، ملک میں اس مسئلہ کا خاص چرچا ہو گیا ہے، اور اس موضوع پر مخالف و موافق اتنا کچھ لکھا گیا ہے، کہ قرآن کے حصہ میں شاید سو سال کے اندر بھی اتنا لٹریچر نہ آیا ہو، اور اس کشمکش سے، سوائے اسکے کہ کثرتِ تعبیر سے خوابِ پریشان ہوتا چلا گیا ہو، کچھ اور حاصل نہیں ہوا، حقیقت یہ ہے کہ بدقسمتی سے مسلمانوں کے اور سینکڑوں مابہ النزاع مسائل کی طرح یہ مسئلہ بھی دو طرفہ متشددین کی قوت آزمائی کا اکھاڑہ بنکر رہ گیا، ورنہ خالی الذہن ہو کر سلامت روی سے اگر اس پر غور کیا جاتا، تو اسقدر طول طویل کشاکش کی نوبت ہی نہ آتی، لیکن فریقین کچھ تو اپنے عقائد کے تشدد کی بنا پر، اور کچھ اپنی اپنی بات کی پچ کے خاطر، لفظی گورکھ دھندوں میں الجھتے الجھاتے جادۂ اعتدال سے بہت دور جا پڑے، اور آج یہ حالت ہو گئی، کہ سرے ڈور کو سلجھا رہے ہیں اور سرا ملتا نہیں،"

حقیقت یہ ہے کہ حدیث کی دینی حیثیت متعین کرنے کیلئے خود رسول کی "دینی حیثیت" کا یقین سب سے ضروری ہے، منکرین حدیث (یعنی حسبنا کتاب اللہ کے ان انوکھے مفسرین) کے نزدیک رسول کی حیثیت اسکے لغوی معنوں تک ہی محدود ہے، یعنی وہ ایک قاصد یا پیامبر ہے، جو ایک بند لفافہ لیکر آیا ہے، اور اس کا منصب فقط اتنا ہے کہ اُسے بحفاظت تمام مکتوب الیہ تک پہنچا دے، اور جس طرح پیغام پہنچا دینے کے بعد اس قاصد کا وجود ایک عضو معطل ہو جاتا ہے، فریضۂ پیغام رسانی کے بعد رسول کی حیثیت بھی بس ایسی ہی کچھ رہ جاتی ہے، اور اس کے بعد اس پیغام کے متعلق کچھ اور کہنا سننا گویا اسکا اپنے فرائض منصبی سے تجاوز کرنا ہے، اور اسلئے قابل پذیرائی نہیں، رسول کیلئے وہ دوسرا لفظ "مبلغ" استعمال کیا کرتے ہیں، اور اس سے مفہوم یہ ہوتا ہے، کہ احکام بدہن، رسول ایک BROAD CASTING STATION کی طرح آلۂ ابلاغ ہے[1]، یعنی اس کا فرض صرف پہنچا دینا ہے، اور اس فرض رسانیدن کے بعد آلہ بس آلہ رہ جاتا ہے، اس دعوی کی دلیل میں وہ قرآن کریم کے اُن آیات سے سند لاتے ہیں جنہیں رسول اکرم کے متعلق ارشاد ہے کہ

فانما علیک البلاغ (آل عمران) | تمہارا فرض تو فقط (پیغام) پہنچا دینا ہو،

اور اس سے استنباط یہ کرتے ہیں کہ چونکہ ان تمام آیات میں "تبلیغ" (پہنچا دینا) حصر کیا گیا ہے، اسلئے رسول کا فرض صرف پہنچا دینا ہے، وضاحت و تبیان نہیں، گویا یہ حصر تبلیغ تبیین کے مقابلہ میں ہے،

آیئے قرآن کی روشنی میں اس دعوی کی حجیت کو پرکھ کر دیکھیں،

قرآن کریم اس پر شاہد ہے کہ نبی اکرم صلعم ایک شفیق ناصح اور ہمدرد طبیب کی طرح مریضان کفر و ضلالت کی ضد اور ہٹ پر بیحد مغموم ہوا کرتے تھے، چنانچہ ارشاد ہے:-

فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ عَلٰی آثَارِهِمْ | پس شاید کہ تو ہلاک کرنے والا ہے جان اپنی کو ان لوگوں
اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا (کہف - ۱) | کے پیچھے مارے غم کے اگر یہ اس بات پر ایمان نہ لائیں،

[1] ملاحظہ ہو تحریری مباحثہ مابین مولوی ثناء اللہ، و مولوی احمد دین، اہل القرآن،

یہی مضمون سورۂ شعراء کے شروع میں ان الفاظ میں ہے:-

لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَلَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (شعراء) | شاید آپ ان کے ایمان نہ لانے پر (رنج کرتے کرتے) اپنی جان دیدیں گے۔

اس پر حضور کو تسلی دی جاتی تھی، کہ آپ ان کے کفر و ایمان کے متعلق غم نہ کریں، اس کا معیار کچھ اور ہے، آپ کے ذمہ تو صرف اسقدر ہے، کہ خدا کے احکام ان تک پہنچا دیجئے، اس کے بعد اگر یہ اعراض کریں گے، تو ہم خود ان سے پوچھ لیں گے، قرآن کریم میں بلاغ کی آیات (علینا یا علیک کے ساتھ) قریب دس جگہ آئی ہیں، اور بلا استثناء ہر ایک جگہ اسی مفہوم کو ادا کرنے کیلئے نازل ہوئی ہیں[2]، چنانچہ ارشاد ہے،

۱- وَقُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ وَالْاُمِّیِّیْنَ | اور کہئے اہل کتاب اور مشرکین عرب سے کہ
ءَاَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا | کیا تم بھی اسلام لاتے ہو، سو اگر وہ لوگ اسلام
وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلٰغُ، | لے آئیں، تو وہ لوگ ہدایت پا جائیں گے[1]، اور اگر وہ
(آل عمران - ۲) | لوگ روگردانی کریں، سو آپ کے ذمہ تو صرف [پہنچا دینا ہے]

۲- وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ | اور تم اللہ تعالی کی اطاعت کرتے رہو اور رسول
وَاحْذَرُوْا فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاعْلَمُوْا | کی اطاعت کرتے رہو اور احتیاط رکھو پس اگر اعراض
اَنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ۔ (المائدہ ع ۱۲) | کروگے تو یہ جان رکھو کہ ہمارے رسول کے ذمے تو صرف [صاف صاف پہنچا دینا ہے]

[1] ہدایت کے معنی راستہ دکھانے کے ہیں، انبیاء اسی معنی میں ہادی ہوئے ہیں،

وَاِنَّکَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۲۳) | تو بیشک ان کو سیدھے راستے کی طرف بلاتا ہے،

دوسرے معنی راستہ پر لگا دینے کے ہیں، یہ کام صرف اللہ کا ہے:-

لَیْسَ عَلَیْکَ هُدٰهُمْ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَاءُ (۲/۳۷) | تیرے ذمے ان کو راہ پر لگانا نہیں ہے، اللہ جسکو چاہتا ہے راہ پر لگاتا ہے

[2] معارف: مفصل بحث سیرۃ النبی جلد چہارم میں ص ۱۴۸ سے ص ۵۴ تک ہے،

اسی سورت میں ایک رکوع آگے جاکر بیت الحرام اور قربانیوں کے سلسلہ میں فرمایا،

۳۔ مَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ۭ وَاللّٰہُ — رسول کے ذمہ تو صرف پہنچانا ہے، اور اللہ

یَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَکْتُمُوْنَ ؛ — سب جانتا ہے، جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو

(المائدہ رکوع ۱۳) — کچھ پوشیدہ رکھتے ہو،

یعنی تبلیغ رسالت کے بعد اتمام حجت ہوگئی، باقی رہا یہ کہ تم کہتے کیا ہو، اور کرتے کیا ہو، سو اسکی بابت اللہ تعالیٰ کو خوب علم ہے،

سورۂ رعد کے آخری رکوع میں اور بھی واضح طور پر فرمایا،

۴۔ فَاِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلٰغُ وَعَلَیْنَا — پس آپ کے ذمہ تو صرف (احکام کا) پہنچا دینا ہے

الْحِسَابُ. — اور دار و گیر کرنا تو ہمارا کام ہے،

سورۂ النحل کے رکوع ۱۱ میں مختلف نعمائے خداوندی کے ذکر کے بعد ارشاد ہے، کہ اللہ تعالیٰ اسطرح تم پر نعمتیں پوری کرتا ہے، تاکہ تم فرمانبردار رہو، پھر

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلٰغُ — اگر یہ لوگ پھر جائیں، تو آپ کے ذمے تو

الْمُبِیْنُ، — صاف صاف پہنچا دینا ہے،

سورۂ نور رکوع ۷ میں اسکی علت مزید وضاحت سے بیان کی گئی ہے،

۵۔ قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ — آپ کہئے کہ اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول کی،

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْہِ مَا حُمِّلَ — پھر اگر تم لوگ (اطاعت سے) روگردانی کروگے تو سمجھ

وَعَلَیْکُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ۭ وَاِنْ تُطِیْعُوْہُ — رکھو کہ رسول کے ذمہ تو صرف (تبلیغ) کا بار رکھا گیا ہے

تَہْتَدُوْا ۭ وَمَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ — اور تمہاری ذمہ داریوں کا بار تمہارے اوپر ہے، اگر تم نے

الْمُبِیْنُ. — رسول کی اطاعت کرلی، تو راہ پر جا لگوگے اور ہر حال

[illegible]

سورۂ الشوریٰ کے رکوع ۵ میں، قیامت کے نہ ٹلنے والے عذاب کے ذکر کے بعد فرمایا، کہ

۶۔ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰکَ — اگر (یہ کچھ سن لینے کے بعد بھی) یہ لوگ

عَلَیْہِمْ حَفِیْظًا ۭ اِنْ عَلَیْکَ — روگردانی کریں، تو ہم نے آپ کو ان پر نگران

اِلَّا الْبَلٰغُ ۭ — مقرر کرکے نہیں بھیجا، (جس سے آپ کو اپنی باز پرس کا احتمال ہے) آپ کے ذمہ تو صرف احکام کا

[illegible]

۷۔ سورۂ تغابن، رکوع ۲ میں بالکل وہی الفاظ ہیں، جو مصرحہ صدر نمبر ۲ میں مذکور ہیں، بہ استثنار لفظ "وَاحْذَرُوْا".

۸۔ سورۂ جن رکوع ۲ میں ارشاد ہے،

قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِکُ لَکُمْ ... ... — آپ کہدیجئے کہ میں نہ تمہارے کسی ضرر کا اختیار

... ... — رکھتا ہوں، اور نہ کسی بھلائی کا، کہدیجئے، کہ

... ... — (اگر میں خدانخواستہ ایسا کروں تو) مجھ کو خدا

... ... — (کے غضب) سے کوئی نہیں بچا سکتا، اور نہ میں

... ... — اس کے سوا کوئی پناہ کی جگہ پا سکتا ہوں، لیکن

... ... اِلَّا بَلٰغًا — خدا کی طرف سے پہنچانا، اور اُس کے پیغاموں

مِّنَ اللّٰہِ وَرِسٰلٰتِہٖ ۭ — کا ادا کرنا (میرا کام ہے)

اب ایک ایسا مقام بھی دیکھ لیجئے، جہاں حضرت رسول اکرم کے متعلق ہی یہ ارشاد نہیں، بلکہ تمام رسولوں کے متعلق یہی فیصلہ ہے، سورہ نحل رکوع نمبر ۵ میں مشرکین کی اس کٹ حجتی کو بیان کرنے کے بعد کہ یہ لوگ یوں کہتے ہیں، کہ اگر اللہ کو منظور ہوتا، تو ہم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرتے، اور نہ ہی ہمارے باپ دادا ایسا کرتے، اور نہ ہم اسکے بدون حکم کسی چیز کو حرام کرسکتے، ارشاد ہے کہ

۹- كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ،

جو لوگ ان سے پہلے گذرے ہیں، انھوں نے بھی ایسی ہی حرکات اکی تھیں، سو پیغمبروں کے ذمے تو (احکام کا) صاف صاف پہنچا دینا ہوتا ہے،

سورہ یٰسین میں دو تین رسولوں کا ذکر ہے، جن کی قوم نے ان کو جھٹلایا، اور محض ضد اور کج بحثی سے اُن سے روگردانی کی، انھوں نے جواب میں کہا:-

۱۰- قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّا اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ط وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ط (رکوع نمبر۱)

ہمارا پروردگار علیم ہے، کہ بیشک ہم تمھاری طرف بھیجے گئے ہیں، اور ہمارے ذمہ تو صرف واضح طور پر احکام کا پہنچا دینا ہے،

یہی وہ مقامات ہیں جہاں آیاتِ تبلیغ حصر کے ساتھ مذکور ہیں، اب ہر صاحبِ ذوقِ سلیم اس کا اندازہ لگا سکتا ہے، کہ یہ آیات اتمامِ حجت، تسکین دہی، اور ذمہ داریوں کے یقین کیلئے آتی ہیں، یا ان سے مقصود یہ ہے، کہ رسولوں کا فریضہ فقط پہنچا دینا ہے، تبئین و وضاحت نہیں ہے، اگر سارے قرآن میں ایک جگہ بھی ایسا ہوتا، کہ لوگ آپ سے فلاں مسئلہ پر وضاحت یا فلاں اجمال کی تفصیل پوچھتے ہیں، ان سے کہہ دیجئے کہ مَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلٰغ، نہ بھائی ہمارا (رسول کا) کام تو فقط ان آیاتِ قرآنی کا (لفافہ) آپ لوگوں تک پہنچا دینا ہے، اور بس، ان آیات کی تفصیل و توضیح میرے حیطۂ فرائض میں نہیں، تو البتہ ان کا یہ دعویٰ ثابت ہو سکتا تھا، کہ چونکہ فرائضِ رسالت میں تبلیغ کا حصر ہے، اسلئے رسول اس سے آگے قدم نہیں بڑھا سکتا، یہ ہماری تحدی ہے کہ قرآن سے کہیں ایک جگہ بھی ایسی شکل دکھا دیں، جب یہ صورت نہیں تو فقط اتنا کہہ کر کہ قرآن میں آیا ہے،

وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ

کہ رسول کا فرض صرف پہنچا دینا ہے،

فوراً اس نتیجہ پر پہنچ جانا کہ اس سے فریضۂ رسالت کی حدو د بندی پر نصِ قطعی مل گئی، یا تو قرآن سے ناواقفیت

کا ثبوت دینا ہے، یا دنیا کے لوگوں کو دھوکا دینا، وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ. (البقرہ) یہ محض اپنے آپ کو فریب دیتے ہیں، اور سمجھتے نہیں" ضمناً اتنا عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ بلاغ کے معنی بھی قرآن کریم نے محض رسانیدن تک ہی محدود نہیں رکھے، بلکہ اس کے مفہوم کا دائرہ اس سے وسیع ہے مثلاً سورۂ الانبیا کے ان آیات میں،

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ط اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ.

اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا کہ زمین کے مالک میرے نیک بندے ہونگے تحقیق اس میں بندگی کرنے والوں کیلئے (ہدایت) کا کافی مضمون ہے[1]

ظاہر ہے کہ زبور میں جو حقیقتِ کبریٰ بیان کی گئی ہے، قوموں کی حیات و ممات کا دار و مدار اس پر ہے، اس حکمتِ بالغہ اور اتنے بڑے عظیم المرتبت اصول کو بلاغ کہا گیا ہے، جس کے معنی "پہنچا دینا" یا محض "پیغام" کسی صورت میں بھی یہاں پیوست نہیں ہوتے، اسی طرح سورۂ ابراہیم کے اخیر میں قیامت اور اس کے روح فرسا مناظر کا ذکر کرنے کے بعد، جزا اور سزا، اور اللہ تعالیٰ کے سریع الحساب ہونے کا ذکر ہے، اور اوس کے ساتھ ہی فرمایا ہے:-

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ،

ظاہر ہے کہ بلاغ کے معنی یہاں بھی محض پیغام نہیں، بلکہ ایسا پہنچانا ہے، کہ جسمیں عبرت و موعظت اور تنذیر و تبشیر کے ہزاروں رموز پوشیدہ ہوں، اور پھر جو دس مقامات اوپر مذکور ہیں، ان میں اکثر و بیشتر جگہ بلاغ مبین آیا ہے، یعنی پہنچانا اور واضح اور صاف صاف پہنچانا، یہ اگر ایک طرف احکام کی صفت ہو سکتی ہے تو دوسری طرف رسانیدن (تبلیغ) کی صفت قرار دینے میں بھی اوسے کوئی امر مانع نہیں، وَمَا عَلَيْنَا

[1] یہ ترجمہ مولوی اشرف علی صاحب تھانوی کا ہے، "پرویز"

الا البلغ المبین.

معترضین کا دوسرا استدلال یہ ہے، کہ چونکہ نبوت ایک وہبی چیز ہے، اس لئے وحی الٰہی (قرآن) کے بعد نبی کا علم وفہم اور استعداد وادراک اپنے ماحول کے عام انسانوں جیسا رہ جاتا ہے، چنانچہ اہل قرآن نے تو اس باب میں اس حد تک غلو کیا ہے کہ اُن کے نزدیک خود نبی اکرم کے زمانہ میں ایسے لوگ موجود تھے، جو خود حضور سے بہتر قرآن سمجھتے تھے[1]،

پُرانوں کی کتھا میں، روپ بسنت کا ایک قصہ آتا ہے، جس میں ایک راجہ جس کے کوئی اولاد نہیں مرتے وقت وصیت کرتا ہے، کہ کل صبح جو سب سے پہلے شہر کے دروازہ میں داخل ہو، اُسے تخت و تاج کا وارث قرار دیا جائے، چنانچہ دوسرے دن چوکیداروں نے دیکھا کہ ایک بھیک منگا فقیر سب سے پہلے شہر پناہ میں داخل ہوا ہے، وہ ہر چند چیختا چلاتا رہا، لیکن انھوں نے ایک نہ سنی، اور اُسے بادشاہ بنا دیا، ہمارے معترضین کے نزدیک نبوت کی موہبت عظمیٰ بھی اس روپ بسنت کی بخشش جیسی ہی ہے، کہ جس بدھو اور جھمن کو چاہا پکڑ کر سرفراز کر دیا، (اللہ تعالیٰ ان کو بصیرت عطا فرمائے، یہ خدا کی حکمت بالغہ پر بہت بڑا اتہام اور مامور من اللہ کے حضور میں سخت گستاخی ہے،) اسمیں شبہہ نہیں کہ نبوت خالصۃً ایک وہبی عطیہ ہے،

قل ان الفضل بید اللہ یؤتیہ — کہدیجئے کہ فضل تو خدا کے قبضہ میں ہے،

من یشاء واللہ واسع علیم — وہ جسے چاہیں عطا کر دیں، اور اللہ تعالیٰ

یختص برحمتہ من یشاء واللہ — بڑی وسعت والے خوب جاننے والے ہیں،

[1] ملاحظہ ہو مباحثہ تحریری مابین مولوی ثناء اللہ و مولوی احمد دین، اہل قرآن،

آج یہ حالت ہو کہ عیسائی اور دیگر غیر مسلم مصنفین جو حضور کو نبی تسلیم نہیں کرتے، انکی بھی متفقہ رائے ہے کہ عقل وفہم، حسن تدبیر اور حکمت وموعظت کے اعتبار سے حضور نہ صرف اپنے ماحول و زمانہ کے انسانوں میں بلکہ تمام دنیا کے بڑے بڑے انسانوں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، اور کئی غیر مسلم مشاہیر نے حضور کو دنیا کا سب سے بڑا انسان قرار دیا ہے، باوصف اس امر کے کہ وہ حضور کو مامور من اللہ تسلیم نہیں کرتے، لیکن دوسری طرف ان اپنوں کا یہ حال ہے کہ وہ حضور کے علم وفہم کو وقت کے بڈوں کے مقابلہ میں بھی برابر کا تسلیم نہیں کرتے، ~ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے، "پرویز"

ذو الفضل العظیم — خاص کر دیتے ہیں، اپنی رحمت کیساتھ جسے چاہیں، اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں، (۳/۷۳-۷۴)

لیکن یہ اختصاص واجتبا اندھا دھند نہیں ہوتا، جسے اس فضل ورحمت اور خدا کی سب سے بڑی بخشش سے سرفراز کرنا ہوتا ہے علم وحکمت کے وہ مدارج عالیہ طے کرائے جاتے ہیں، کہ جو اکتسابی طور پر کسی انسان کے حصہ میں نہیں آسکتے، رموز واسرار فطرت کے پردے اس کے سامنے سے اٹھا دئے جاتے ہیں، اصلاح واستبقائے امم کے محکم اصول اور تزکیۂ نفوس وقلوب کے مہتم حقائق اس پر واضح کئے جاتے ہیں، چنانچہ قرآن کریم میں جن انبیائے کرام کا ذکر آیا ہے، انکے متعلق یہ بھی بصراحت مذکور ہے، کہ انھیں نبوت کیساتھ ساتھ علم و[1] حکمت کی نعمت بھی عطا کیگئی، حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ارشاد ہے:۔

ولقد آتینا ابراہیم رشدہ — اور ہم نے اس سے قبل ہی ابراہیم کو خوش

من قبل وکنا بہ علمین. (الانبیا) — فہمی عطا کر رکھی تھی، اور ہم اون کو خوب جانتے تھے،

حضرت لوطؑ کے متعلق مذکور ہے،

ولوطا آتیناہ حکما وعلما (الانبیا) — اور لوط کو ہم نے حکمت وعلم عطا فرمایا،

حضرت داؤد وحضرت سلیمان علیہما السلام کے متعلق ارشاد ہے:۔

وکلا آتینا حکما وعلما (〃) — اور دونوں (داؤد وسلیمان) کو ہمنے حکمت وعلم دیا،

سورۂ نمل آیت ۱۵ میں بھی ان دونوں کو علم عطا فرمانے کا ذکر ہے، حضرت یحییٰ کے متعلق مذکور ہے،

وآتیناہ الحکم صبیا، (مریم) — اور ہمنے اس (یحییٰ) کو بچپن ہی میں سمجھ (حکمت) عطا فرما دی تھی،

حضرت یوسفؑ کے متعلق آیا ہے،

ولما بلغ اشدہ آتیناہ حکما وعلما (یوسف) — اور جب (یوسف) جوانی کو پہنچے تو ہمنے انھیں حکمت وعلم عطا فرمایا،

[1] معارف:۔ یہ بحث سیرۃ النبی جلد چہارم میں ص ۱۱۲ سے ص ۱۲۱ تک ہے،

حضرت موسیٰؑ کے متعلق ارشاد ہے :-

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰىٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا (قصص)

اور جب (موسیٰ) جوانی کو پہنچے، اور مضبوط ہوگئے تو ہم نے اُسے حکمت و علم عطا فرمایا،

آلِ ابراہیم کے متعلق ارشاد ہے :-

فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا (۴-۵۴)

آلِ ابراہیم (کے پیغمبروں کو) ہم نے کتاب اور حکمت عطا فرمائی، اور (نیز) انھیں بہت بڑی سلطنت دی۔

ان انفرادی مثالوں کے علاوہ اجتماعی طور پر تمام انبیاے کرام کے متعلق بھی ایسا ہی ارشاد ہے، چنانچہ سورۂ انعام میں ہے :-

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ (انعام) یہ وہ لوگ ہیں کہ جنھیں ہم نے کتاب اور حکمت اور نبوت عطا کی تھی،

ان آیات سے ظاہر ہے کہ عطیۂ نبوت کے ساتھ ساتھ ان حضرات کرام کو علم و حکمت کی نعمت بے بدل بھی عطا فرمائی جاتی تھی، اب آیئے رسول کی طرف، اور دیکھیے کہ اس زمرۂ مجتبین (علیہم السلام) میں حضورؐ کا کیا مرتبہ ہے، اور وہ تمام برگزیدہ ہستیاں جنکی نبوت و حکمت کی گواہی قرآن نے دی تھی، اور جن پر ایمان لانے کیلئے ان کی امتوں کو حکم دیا گیا تھا، انھیں حضور کے متعلق بارگہ ایزدی سے کیا فرمان متاہی ارشاد ہے :-

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ ..... مَعَ الشّٰهِدِيْنَ (آل عمران ۹)

اور جب اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے عہد لیا کہ جو کچھ میں تم کو کتاب اور حکمت دوں پھر تمہارے پاس وہ پیغمبر آئے جو مصدق ہو اس کا جو تمہارے پاس ہے، تم ضرور اس پر ایمان بھی لانا، اور اسکی طرفداری بھی کرنا، فرمایا کہ آیا تم نے اقرار کیا، اور اس پر میرا عہد قبول کیا؟ وہ بولے ہم نے اقرار کیا، ارشاد فرمایا تو گواہ رہنا اور میں اس پر تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔

علم و حکمت اور کتاب و نبوت کے حاملین کو تو حکم دیا جاتا ہے کہ اس نبی امیؐ کی علم و حکمت پر ایمان لانا، اور اس میثاق و عہد کو اس درجہ اہمیت دی جاتی ہے کہ خود خداے لم یزل اس قول و اقرار کا گواہ بنتا ہے، لیکن آج کے "امتیوں" کا یہ حال ہے، کہ اس کی علم و حکمت کو ان لوگوں کے جتنا بھی نہیں سمجھتے، جو خود اس سراج منیر سے

کسب ضیا کیا کرتے تھے، قرآن شاہد ہے کہ وہ سید کائنات، فخر موجودات، وہ حکیم عرب، مکی و مدنی، معلم الناس، معلم انس، متعلم خدا، علم و حکمت، رموز و معارف، حقائق و دقائق کے اس افق اعلیٰ اس معراج کمال تک پہنچ چکا تھا، کہ جہاں نہ اس سے قبل کوئی پہنچا، اور نہ اسکے بعد قیامت تک کسی کو اسکا خواب دیکھنا بھی نصیب ہوا، کیا ہر روز قرآن پڑھنے والے سورۂ نجم کے ان آیات پر سے آنکھ بند کرکے گذر جاتے ہیں :-

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۙ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ...... اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى (۱-۲)

قسم ہے ستارے کی جب وہ غروب ہونے لگے، کہ تمہارا رفیق (محمد) نہ تو غلط چل رہا ہے، اور نہ کچھ بہک گیا ہو، نہ اپنی خواہش نفسانی سے باتیں کرتا ہو، بلکہ وہ نری وحی ہے جو اُن پر بھیجی جاتی ہے، اس کو (یہ سب معارف) شدید القویٰ اور غالب خدانے (خود) سکھائی ہیں، پس وہ اوج کمال پر پہنچکر (استویٰ) (علم و حکمت کے) رفق اعلیٰ پر مکین ہوا، نہیں اور اس سے بھی نزدیک ہوگیا اور (قریب) اُتر آیا، (حتیٰ کہ) دو کمانوں کے برابر یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا، تب اسکو وہ بات وحی کی جو نازل فرمانی تھی، اور اسکے قلب سلیم نے اس چیز میں جو اس نے دیکھی تھی کوئی غلطی نہیں کی، پس کیا تم اس سے ان معارف و حقائق کی بابت جھگڑتے ہو جو اس نے خود مشاہدہ کئے ہیں"

کیا اس سے بہتر اوج علم و کمال اور مشاہدات رموز و حقائق کسی اور کو بھی میسر آئے ہیں، کیا دنیا کا بڑے سے بڑا حکیم اور عقلمند یہ دعویٰ کرسکتا ہے، کہ ان رازہاے سربستہ کا مشاہدہ اسکے خدانے اسے کرادیا ہے، ممکن ہے یہ کہہ دیا جائے، کہ بحث تو قرآن فہمی کے متعلق ہے، اس تعمیم سے اس تخصیص پر دلالت نہیں ہوسکتی، سو قرآن نے اسکا بھی فیصلہ کردیا ہے، کہ حضورؐ کی قرآن فہمی کا سرچشمہ کون ہے، ارشاد ہے :-

وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ (۶-۷)

اور بالیقین آپکو خدای حکیم و علیم کے ہاں سے قرآن سکھایا جاتا ہے،

اس آیت میں "حکیم علیم" کے الفاظ بڑے نکتہ آفرین ہیں، انبیاے کرام کے متعلق ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں "علم و حکمت" عطا فرمایا تھا، پس تعلیم قرآن میں وہی علم و حکمت ہے، جو خداے علیم و حکیم کی طرف سے حضور کو عطا فرمائی جارہی ہے، پھر

اَلرَّحْمٰنُ ۙ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ

(خداے) رحمن نے قرآن کی تعلیم دی

یہاں حضور کے "علم القرآن" کا سرچشمہ خود خداے رحمن بتایا گیا ہے، جسکی یہ بخشش ہے، جو بلا اکتساب تو ہبًا مل رہی ہے،

(باقی)

گرین کا سیاسی فلسفہ

از

جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب بی اے (علیگ)

ٹامس گرین، ۷ اپریل ۱۸۳۶ء میں یارک شائر کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا، ابتدائی تعلیم اس نے گھر پر حاصل کی، پھر وہ رگبی میں پانچ برس تک تعلیم حاصل کرتا رہا، آکسفورڈ سے فارغ التحصیل ہو کر اسی مرکز میں فلسفہ کا اُستاد ہو گیا،

گرین انیسویں صدی کا بلند پایہ فلسفی سمجھا جاتا ہے، مل اور گرین دونوں ہمعصر تھے، وہ آکسفورڈ کے زمانہ میں مل کے خیالات سے متاثر ہوا، اس کے سیاسی نظریے انیسویں صدی کے اواخر میں مقبول ہوئے، خصوصاً اُسے اس گروہ میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی جو کانٹ اور ہیگل کے نظریات تسلیم کرتا تھا، اس کے خیالات زیادہ تر ہیگل کے فلسفہ پر مبنی تھے، لیکن اس کا نمایاں امتیاز یہ ہے، کہ وہ ایک منظم مفکر تھا، اسکے متعلق لارڈ برائس کہا کرتا، کہ "اس کے نظریہ میں کسی قسم کی بے ترتیبی اور بے افتادگی نہیں ہے" نٹیل شپ کا قول ہے، کہ "اس نے خیالات یکایک معلوم نہیں کئے، بلکہ اوس کے تمام نتائج ایک دوسرے سے مربوط ہیں" یعنی اوس کے مذہبی، سیاسی، اخلاقی اور مابعد الطبیعاتی خیالات ایک قابلِ فہم نظام کے مربوط و متحد اجزا ہیں،

گرین نے لاک، برکلے، ہیوم، اسپنسر اور کانٹ کے نظریات کا ناقدانہ مطالعہ کیا تھا، اور اوس کے بعد ایک تعمیری اور قابلِ عمل پہلو اختیار کیا، جسے اوس نے اپنی دو کتابوں یعنی "پرنسپلس آف پولیٹیکل ابلیگیشن" (Principles of Political obligation) اور پرولیگومینا آف ایتھکس

(Prolegomena of Ethics) میں پیش کیا، پہلی کتاب میں اوس نے حکومت کے ان قوانین کے اخلاقی مقاصد کے معلوم کرنے کی کوشش کی ہے، جو حکومت کی طرف سے انسانوں کے حقوق و فرائض سے متعلق نافذ ہوتے ہیں، اور وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے، کہ سیاسی ادارے یعنی حکومتیں اور اون کے قوانین اسی وقت تک برحق قرار دیئے جاسکتے ہیں، جب تک کہ وہ افراد کے اخلاقی پہلو کی تکمیل میں معاون ہوں، اس کا خیال ہے، کہ قانون پر باقاعدانہ نظر دو ہی اصول کے ماتحت ڈالی جاسکتی ہے، اول یہ کہ افراد کے صرف ظاہری افعال پر قوانین کا نفاذ ہو، دوم یہ کہ قوانین کا معیار صرف اخلاقی اغراض کے لئے قائم کیا جائے، کیونکہ نفاذ قانون کا مقصد اخلاق کی بہتری اور ترقی پر ہوتا ہے، ایک فعل جو صحیحاً اخلاقی ہو، وہ لازمی طور پر انسان کی بہترین نیت کا نتیجہ ہوگا، لیکن ریاست نیت کو ہرگز نہیں دیکھ سکتی، اس کا فرض تو محض یہ ہے، کہ وہ ایسے کاموں کیلئے قوانین نافذ کرے، جنکے عمل میں آنے سے سوسائٹی کے اخلاق میں ترقی ہو، قانون ایک فعل کے ارادے پر غور و خوض کر سکتا ہے، قانون کا تخیل یہ ہے، کہ وہ تمام رکاوٹیں دور کرکے ایسی موافق فضا پیدا کر دے جس سے اخلاقی مقاصد کے حصول میں افعال کو ہر قسم کی مدد ملتی رہے، لیکن افعال کا ارادی ہونا ضروری ہے، کیونکہ وہ قانوناً لازمی نہیں کئے جاسکتے، مجلس مقننہ کے کسی قانون سے اخلاق کی درستی نہیں ہو سکتی، صرف ظاہری افعال کی نگہداشت ہو سکتی ہے، ایک قانونی فعل اخلاقی نہیں کہا جاسکتا، اخلاقی فلاح ایک مشترکہ بہبودی ہے، جسکی تحصیل باہمی ارادہ اور اتفاق سے ہو سکتی ہے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے، جبکہ افراد کسی ایک سوسائٹی کے ارکان ہوں، حکومت کا فرض یہ ہے، کہ زندگی کے ایسے حالات قائم رکھے جنمیں اخلاق کی نشو و نما ہو سکے، اور شہریوں کے حقوق اس معنی کے لحاظ سے آزادی ہو کہ وہ جو چاہیں، کریں، مگر مشترکہ مفاد کی غرض سے کریں، حقوق محض اس لئے ہوں، کہ ان سے مشترکہ فلاح و بہبودی وقوع پذیر ہوتی رہے، اسلئے افراد کے حقوق کا تخیل مشترکہ مفاد سے بالاتر نہیں کیا جاسکتا، حقوق ریاست کے افراد ہونے سے حاصل ہو سکتے ہیں، پس کوئی فرد اس وقت تک حقوق حاصل نہیں کرسکتا جب تک کہ (۱) وہ کسی سوسائٹی کا فرد نہ ہو، (۲) اور جبتک کہ اس سوسائٹی میں مشترکہ مفاد کا

تخیل قائم نہ ہو جسکو تمام افراد اپنا مفاد سمجھتے ہوں،

چنانچہ یہ نظریہ کہ انسان غیر اجتماعی حالت میں بعض ایسے "قدرتی حقوق" پر اختیار رکھتا تھا جن سے متمتع ہونے کے خیال سے کسی سوسائٹی کی بندشوں کو اپنے اوپر عائد کر لیتا تھا، صحیح نہیں ہے، کیونکہ قدرتی حقوق وہ ہیں، جو حاصل ہوں، لیکن فطرت کی اصلی حالت کا نام تو سوسائٹی نہیں، حقوق کا تخیل اسوقت تک نہیں کیا جا سکتا، جبتک سوسائٹی کے افراد میں مشترکہ افراد کا خیال ذہن نشین نہ ہو، اس کی عدم موجودگی میں ممکن ہے، کہ ایک سوسائٹی کے بعض افراد صاحب اختیار ہوں لیکن اگر انھوں نے اپنے اختیار کو نہ تسلیم کرایا اور نہ تسلیم کرانے کے دلائل رکھتے ہوں، تو پھر وہاں حقوق کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اس تخیل سے کہ افراد فطرت کی اصلی حالت میں حقوق رکھتے ہیں یہ نتیجہ ہوا کہ افراد کے دلوں میں ریاست کی طرف سے بے اعتنائی اور بے حرمتی پیدا ہو گئی، وہ سمجھتے ہیں کہ سوسائٹی سے آزاد ہو کر حقوق کا مصرف لے سکتے ہیں، خواہ وہ سوسائٹی کے فرائض پورا کریں، یا نہیں، اور ان کا خیال ہے، کہ حکومت کی تمام بندشیں ان کی فطری آزادی کے لحاظ سے بے معنی ہیں، جنکی خلاف ورزی میں وہ ایک حد تک حق بجانب ہیں،

ریاست کے قوانین اور ادارے عامۃ الناس کے مجموعی ذہن اور خواہش کے مجسمے ہیں، ریاست کے اندر رہکر افراد ایک دوسرے کے حقوق کی فکر کر سکتے ہیں، یہ حقوق ایسی قوتیں ہیں، جنکے بغیر مشترکہ منفعت کی [illegible] ناممکن ہے، ان ہی قوتوں کے ذریعہ انسان اخلاق کا دامن پکڑے ہوئے اپنے مختلف کاموں کو انجام دے سکتا ہے ایک زندہ جسم کے اعضا زندگی کی بقا کے لئے اسی وقت تک تمام کاموں کو بخوبی انجام دیتے ہیں، جبتک وہ اس کے لاینفک اجزا بنکر رہتے ہیں، اسی طرح انسان کے حقوق اسی وقت تک محفوظ رہ سکتے ہیں جبکہ وہ ایک ریاست کے شہری بنکر رہیں، اور اخلاقی مقاصد کے حصول میں کوشاں رہیں، ریاست کا وجود افراد کی مخالفت پر مبنی نہیں، افراد اور ریاست کے مابین جنگ اسی طرح مضحکہ خیز ہے، جس طرح کہ ہاتھ اور جسم کی جنگ مضحکہ خیز معلوم ہوگی، ریاست خود شعور اشخاص کے منظم اتحاد کا نام ہے، جس سے علحدہ ہو کر وہ اپنے حقوق قائم نہیں کر سکتے

ہیں، ریاست کی قوتوں اور بندشوں کو تسلیم کرنا چاہیے، کیونکہ انہیں تسلیم کر کے ہم اپنی زندگی کی عقلیت کے چند لازمی شرائط پورا کرتے ہیں، ادارے جو آدمی کے کردار کی رہنمائی کرتے ہیں، مشترکہ مفاد کے مظاہر ہیں، ان میں عامۃ الناس کی خواہش کی تشکیل اور تکمیل ہوتی ہے، اسی کو ملحوظ رکھکر نہ کہ محض خوف سے انسان ریاست کی بندشوں کو قبول کر لیتا ہے، ریاست کی بنیاد جبر پر نہیں بلکہ خواہش پر ہے، اگرچہ فرمانروائی کے لئے جبر ایک ضروری جزء ہے، اور اس کا استعمال قانون اور امن کے تحفظ کے لئے ان افراد کے خلاف ضرور کیا جاتا ہے جنمیں مشترکہ بہبودی کے مساعی جمیلہ کی کمی ہوتی ہے، لیکن قدرتی طور پر سوسائٹی کی یہ بندش نہیں، ایک سیاسی سوسائٹی کی بقا کے لئے یہ ضروری ہے، کہ آدمی اس کے قوانین کا اعادہ اپنی مرضی سے کرے،

سیاسی اطاعت غلامی نہیں کیونکہ اس سے عامۃ الناس کے حقوق حاصل ہوتے ہیں، جو سراسر انہیں کے مفاد پر مبنی ہیں، لیکن یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ کتنے لوگ ایسے ہیں، جو ریاست کے تمام قوانین کی پابندی محض اسلئے کرتے ہیں، کہ یہ مشترکہ مفاد کے مظہر ہیں، ہم میں سے تو زیادہ تر لوگ ریاست کی اطاعت اس لئے کرتے ہیں کہ ان کے سوا ان کے لئے اور کوئی چارہ نہیں، اس میں شک نہیں کہ مشترکہ مفاد کا مجرد تخیل بہت سے اشخاص کے خیالات کی رہنمائی نہیں کرتا، وہ زندگی کے نفسیاتی قواعد کے پابند ہیں، وہ دیکھتے ہیں کہ ان کے حقوق دوسروں کے حقوق کے ساتھ مشروط ہیں، لیکن مشترکہ مفاد روزانہ زندگی کے تمام کاموں کی انجام دہی سے حاصل ہو سکتا ہے، یہ احساس کہ ایک اچھی اور مہذب زندگی، ریاست ہی کے ذریعہ بسر ہو سکتی ہے، ایک آدمی کو ریاست کا فرمانبردار بنانے کیلئے کافی ہے، لیکن مخلص اور سچا محب وطن بننے کیلئے یہ بھی ضروری ہے، کہ وہ ریاست کے فرائض ادا کرنے میں خود دلچسپی لے اور ان قوانین کی تشکیل میں ہاتھ بٹائے، جنکی پابندی اسکے لئے بھی ضروری ہوگی،

اس میں شک نہیں کہ ریاست کے بعض بانی خود غرض ہو کر اپنے مقاصد کی تکمیل کیلئے قابل اعتراض رویہ اختیار کر لیتے ہیں، اور اپنے ذاتی جلب منفعت کے لئے افراد کی بہبودی کا خیال نہیں کرتے، اور اس کے باوجود وہ حکومت کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں، لیکن انھیں کامیابی ان کی خود غرضی کی بنا پر حاصل نہیں ہوتی، بلکہ

کامیاب اس لئے ہوتے ہیں، کہ وہ ان تخیلات اور محسوسات کو عملی جامہ پہناتے ہیں، جو انسان کی سوسائٹی پر طاری ہو چکے ہیں، اور عملی صورت میں آنے کے لئے محض ذرائع اور حالات کے منتظر ہیں،

اگرچہ ایک طاقت اعلیٰ، ریاست کے وجود کے لئے ضروری ہے، لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ریاست کا وجود جبر و طاقت پر منحصر ہے، جبر کا استعمال محض حقوق اور قوانین کے تحفظ کے لئے ہوتا ہے، اور کوئی ریاست قائم نہیں رہ سکتی جب تک کہ اوسے یہ حق حاصل نہو، ریاست ایک فرمانروا کے ماتحت افراد کے اجتماع کا نام نہیں، بلکہ یہ اون افراد کی مکمل تنظیم کا نام ہے، جو ایک مشترکہ ذہن اور مشترکہ مقصد رکھتے ہیں، اور مشترکہ مفاد کے لئے کوشاں ہیں، ریاست کا فروغ جدید سوسائٹی کی تخلیق مشترکہ دلچسپیوں کی توسیع اور نئے حقوق کی پیدائش سے برابر ہوتا ہے، اگر ریاست جبر و طاقت استعمال کرتی ہے، تو اس لئے نہیں کہ افراد کے مفاد کی مخالفت کرتی ہے، بلکہ اس لئے کہ افراد کی سوسائٹی کی بہبودی اس کے ذریعہ ہوتی ہے، افراد سوسائٹی کے ارکان ہیں، اور اون کے حقوق، سوسائٹی ہی کے اندر ہونے چاہئیں، وہ اپنے حقوق کا تخیل سوسائٹی سے باہر ہو کر نہیں کر سکتے، اور نہ ریاست انھیں اپنے حقوق کا اسطرح اختیار دے سکتی ہے جو سوسائٹی کے مفاد کی مخالفت پر مبنی ہو،

لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ریاست کی مخالفت کسی حال میں جائز نہیں، اور کیا ہمیں اس کے ہر قانون کی خواہ کیسے ہی نامناسب ہو پابندی کرنی چاہئے، ان سوالات کے جواب صرف یہ ہو سکتے ہیں کہ ہمیں ہرگز کوئی رویہ ایسا اختیار نہیں کرنا چاہئے، جس سے ہمارا معاشرتی نظام درہم برہم ہو جائے، کیونکہ معاشرتی نظام ہی پر ہمارے حقوق کا انحصار ہے، اگر ہم کسی قانون کو نامناسب سمجھتے ہوں تو ہم اپنی تمام کوششوں سے اوسے منسوخ یا ترمیم کر سکتے ہیں، لیکن یہ کوششیں آئینی طریقہ سے ہونی چاہئیں، اور جب تک یہ منسوخ نہ ہو جائے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی پابندی کرتے رہیں،

لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر آئینی ذرائع ناممکن ہوں، یا آئینی ذرائع قانون کے ترمیم یا منسوخ

کرانے میں بے اثر ثابت ہوں، تو کیا وسائل اختیار کرنے چاہئیں، تو اوس کے جواب میں یہ انگریز مفکر کہتا ہے، کہ تو پھر عدول حکمی ہمارا فرض ہو جاتا ہے، لیکن یہ عدول حکمی مشترکہ مفاد کی خاطر ہونی چاہئے، جس کو عامۃ الناس نظر تحسین سے دیکھیں، یہ کبھی کسی ایک فرقہ سے محدود طبقہ کے لئے نہیں ہونا چاہئے، ہم میں سے جو عدول حکمی پر آمادہ ہوں، اچھی طرح غور کر لیں کہ اس کے ذریعہ کہاں تک ان کی شنوائی کے لئے آمادہ ہے، اور کیا ان کو کامیابی اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی، جب تک کہ ریاست کی کایا پلٹ نہ ہو جائے، اور کیا اس کایا پلٹ سے طوائف الملوکی تو نہ پھیل جائے گی، اگر ریاست شنوائی کے لئے تیار نہیں، تو پھر بغاوت جائز ہے،

حقوق کا انحصار آدمی کی معاشرتی فطرت پر ہوتا ہے، اس میں شک نہیں کہ بعض حقوق ایسے بھی ہیں، جو ریاست کی تنظیم کے ساتھ وجود میں آتے ہیں، لیکن تمام حقوق ایسے نہیں بہت سے حقوق ریاست کے وجود کے بغیر بھی ہوتے ہیں، مثلاً زندگی اور آزادی کے حقوق،

رومی قوانین، رواقیت اور عیسائیت کے نظریۂ اخوت نے تمام جبری پابندیاں رفتہ رفتہ دور کر دی ہیں اور انسان کو زندگی کی مکمل آزادی دی ہے، لیکن افراد کی یہ آزادی اسی حد تک ہے، کہ وہ انسانیت اور سوسائٹی کے مفاد کے خلاف نہ جائیں،

آزادی اور زندگی کے حقوق جنگ کے زمانہ میں باقی نہیں رہتے، لیکن یہ ہرگز سراہنے کے لائق نہیں، اس میں شک نہیں کہ حکومتوں کی جنگ اور شخصی قتل دونوں ایک ہی چیز نہیں، کیونکہ قتل اس لئے ہوتا ہے، کہ ایک شخص کسی دوسرے شخص کو مار کر ذاتی منفعت حاصل کرے، لیکن پھر بھی جنگ زندگی کے حقوق کی پامالی کرتی ہے، اور جنگ کے علمبردار انسانیت کے دشمن ہیں، یہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض موقعوں پر جنگ ہی ایک واحد وسیلہ باقی رہ جاتی ہے، جس سے ریاست کی بقا قائم رہ سکتی ہے، چنانچہ جنگ کے موقع پر افراد کی زندگی کے حقوق کی جو پامالی ہوتی ہے، وہ محض اس لئے کہ وہ اپنی موجودہ زندگی سے بہتر اور زیادہ معزز زندگی بسر کر سکیں، اس لئے ریاست جو جنگ میں مدافعانہ پڑتی ہے، اس الزام سے بری ہو سکتی ہے، لیکن وہ لوگ

ہرگز بری قرار نہیں دیئے جاسکتے، جو اس کے بنیادی طور پر ذمہ دار ہوتے ہیں، اگر جنگ قومی آزادی کے لئے ضروری ہے، تو یہ محض انسانیت کی اخلاقی حالت کی پستی ہے، جنگ اس لئے نہیں ہوتی، کہ فرمانروا ریاست قائم نہیں، بلکہ اس لئے کہ وہ ان اصولوں پر قائم رہے، جن پر اسے ہونا چاہئے، ریاست تو ایک ادارہ ہے جس میں تمام حقوق کی پرورش ہوتی ہے، اور جو ان تمام ممکن ذرائع کو جن سے حقوق پیدا ہوتے ہیں فروغ دیتی رہی ہے، اگر ایک ریاست اپنے مقصد میں راسخ ہے، تو یہ دوسری ریاستوں کے لئے باعثِ ضرر نہیں ہوسکتی، ریاستوں کے درمیان کوئی ایسی چیز ہو ہی نہیں سکتی، جس کو ہم ناگزیر تصادم کہہ سکیں، ریاستوں کے مقاصد جتنے ہی زیادہ راسخ ہوں گے، اتنے ہی جنگ کے امکان کم ہوتے جائیں گے، اس میں شک نہیں کہ حب الوطنی اور ایثار کا جوش و خروش جنگ ہی کے موقع پر دیکھنے میں آتا ہے، لیکن ہمارے پاس جب ایسے دوسرے ذرائع اور طریقے موجود ہیں، کہ جن سے ہم ان جذبات کا اظہار کرسکتے ہوں، تو پھر جنگ کی طرف رجوع ہونے کی کیا ضرورت ہے،

آزادی اور زندگی کے حقوق کی پائمالی سزا اور تادیب کے ذریعہ بھی ہوتی ہے، لیکن اسے جائز اسلئے سمجھا جاتا ہے، کہ افراد ایک قومیت کے ارکان ہو کر اس کی فلاح و بہبودی کے لئے اسی وقت کوشاں ہونگے جب وہ تعدی اور تشدد سے محفوظ رہیں، سزا تو محض سوسائٹی کے افراد کو تشدد سے بچانے کیلئے عائد کی جاتی ہے اس کی نوعیت تعزیری (Priventive) اور اصلاحی بھی ہے، سزا اس لئے عائد کی جاتی ہے، کہ سزا یافتہ اشخاص سمجھیں کہ سوسائٹی کے ایسے بھی حقوق ہیں، جن کی پائمالی کسی حالت میں روا نہیں، لیکن ایسی حالت میں سزا اتنی ہی ہونی چاہئے، جتنی کہ ایک جرم کے سدباب کے لئے ضروری ہے، سزا کا اصلاحی ہونا بھی لازمی ہے، اس سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ ریاست مجرموں کی اخلاقی حالت کو ترقی دے، جو بیشک اس کے اختیار سے باہر ہے، لیکن حقوق کی محافظت کے لئے ضروری ہے کہ ان مجرمانہ افعال میں کمی کرنے کی کوشش کرے، اس کو یاد رکھنا چاہئے کہ مجرم حقوق سے ہمیشہ کیلئے محروم نہیں ہوجاتے، بلکہ انکی سزائیں محض اسلئے ہوتی ہیں

کہ وہ پھر ان حقوق کے حقدار ہوجائیں،

انسانی زندگی کے احترام کے جذبہ میں ہر جگہ روزافزوں ترقی ہو رہی ہے، اور یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ انسان کی زندگی کے حقِ آزادی میں کسی قسم کی مداخلت جائز نہیں تاکہ اس میں بلا روک ٹوک ایسی صلاحیت پیدا ہو کہ وہ مشترکہ مفاد کے لئے کوشاں رہے، اور یہ صلاحیت کسی جبری قانون کے ذریعہ پیدا نہیں ہوسکتی، بلکہ یہ محض معاشرتی منفعت کے تاثرات سے خود بخود پیدا ہوتی ہے، اس لئے ریاست کو جو کچھ کرنا چاہئے، وہ یہ کہ افراد کے مہذب شہری بننے کے راستہ میں جتنی رکاوٹیں ہوں انھیں دور کرے،

گرین کے نزدیک ریاست محض ایک تنظیم ہے، جس کا مقصد شہریوں کو حتی الامکان فروغ دینا ہے، پھر جس کو ہم اشتراکی قانون کہتے ہیں، گرین اس کی حمایت بھی اس لئے کرتا ہے، کہ وہ ایک آزاد اخلاقی زندگی کے لئے خاطر خواہ فضا پیدا کرتا ہے، لیکن وہ اس کی مخالفت کرتا ہے، کہ نیت پر کوئی جبری قانون نافذ کیا جائے، لیکن یہ کیا درست ہے، کہ جو چیز قانوناً نافذ کی جاتی ہے، وہ بالارادہ وقوع پذیر نہیں ہوسکتی، ایک صالح آدمی اپنے فرائض نہایت ایمانداری سے انجام دیتا ہے، خواہ ریاست کے قوانین اس پر عائد ہوتے ہوں یا نہوں، جہاں تک اس کی ذات کا تعلق ہے، وہ تمامتر جبر سے بے تعلق ہے، اگر ایک ریاست اپنے شہریوں کو فوج میں بھرتی کرتی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ رضا و رغبت سے فوجی خدمت کو انجام نہیں دیں گے، قانون اور آزادی ایک دوسرے کے مخالف نہیں، عقلی قوانین تو آزادی کے مظاہر ہیں، افراد اگر ان کی روشنی میں چلتے ہیں، تو گویا اندرونی مقاصد کی ہدایت میں چل رہے ہیں، جبری قانون کے نفاذ میں ریاست پر جو واجب بندش ہوسکتی ہے، وہ محض مقصد کے لحاظ سے، ریاست کے تمام جبری قوانین روا سمجھے جاسکتے ہیں، اگر وہ شہریوں کی صلاحیتوں کی نشوونما میں معاون ہوں، اس لئے اس میں شک نہیں کہ گرین ارسطو اور ہیگل کے سیاسی نظریات کو فطری طور پر پیش کرنے میں کامیاب ہوا، لیکن اپنے زمانہ کی انفرادیت کے اثرات سے بھی بری نہ رہ سکا،

پھر بھی گرین کا سیاسی نظریہ انفرادیت کے خلاف نہایت موثر طریقہ پر پیش کیا جاسکتا ہے، اس کے خیال کے مطابق افراد اور ان کے تمام حقوق بالکل بے معنی ہیں، اگر وہ کسی اجتماعی نظام سے وابستہ نہیں ہیں، حقوق تو محض اس لئے دیے جاتے ہیں، کہ وہ معاشرتی منفعت کی بہبودی کے لئے استعمال میں لائے جائیں، وہ گویا سوسائٹی کے فرائض بجالانے کے لئے تسلیم شدہ ذرائع ہیں،

انسانیت کا جو اولین حق ہے، وہ یہ کہ وہ ایک صالح انسان ہو، ایک صدی سے دنیا میں "انسانیت کے حقوق" کا شور سنا جارہا ہے، لیکن یہ حقوق سوسائٹی کے فرائض کی انجام دہی کے ذریعہ حاصل ہوسکتے ہیں، اور اسی حقیقت کو گرین نے زور شور سے پیش کیا، اسی حقیقت کو جب ہم فراموش کر جاتے ہیں، تو پھر ریاست کی طرف سے بے حرمتی پیدا ہوجاتی ہے، اور معاشرتی اور سیاسی اصلاحات کا حقیقی مقصد تو یہی ہو کہ حقوق کے استعمال سے فرائض کی انجام دہی میں ہر قسم کی آسانیاں فراہم ہوں نہ یہ کہ صرف حقوق کی ایک بہشت بن جائے، اور فرائض بالکل کالعدم ہوجائیں،

زندگی کے حقوق کے ساتھ ملکیت کے حقوق بھی وابستہ ہیں، ملکیت زندگی کا ایک آلۂ کار ہے، زندگی کے نظام کی تکمیل اور بلند حوصلگی کو موثر بنانے کے لئے یہ ایک مستقل آلہ ہے، اس پر قبضہ رکھنا اخلاقی زندگی کے حصول کے لئے نہایت لازمی ہے، لیکن آدمی مساوی طور پر فطرت پر غالب نہیں آسکتا، اس کی صلاحیتیں مختلف ہیں، اس لئے ملکیت بھی افراد میں مساوی طور پر منقسم نہیں ہوسکتی، ہاں اگر حصول ملکیت میں دوسروں کے حقوق پامال ہوتے ہوں، تو البتہ اس کے سد باب کی ضرورت ہے، کوئی وجہ نہیں کہ ہم یہ تصور کرلیں کہ ایک آدمی کی دولت کی زیادتی سے دوسرے کی دولت میں کمی واقع ہوجائے گی، یا یہ کہ چونکہ دولت میں لامحدود طریقہ سے زیادتی ہوتی رہتی ہے، اس لئے ایک آدمی دوسرے آدمی کی دولت غصب کرتا رہیگا، البتہ یہ اندلال زمین کی ملکیت کے سلسلہ میں قابل لحاظ ہوسکتا ہے، کیونکہ زمینیں محدود ہوتی ہیں، اگر چند آدمی بڑے رقبے کے مالک بن بیٹھیں، تو پھر دوسروں کے حقوق کی گنجایش باقی نہیں رہتی،

اور رعایا کی مفلسی کا یہ سبب نہیں کہ دوسروں کے پاس مال واسباب کی فراوانی ہے، بلکہ اوسکے وجوہ نظام ملک کے طریقے ہیں، اور یہ ریاست کا فرض ہے، کہ وہ افراد پر ایسی نگہداشت رکھے، کہ وہ اپنے معاش کے حقوق کو اس طرح عمل میں نہ لائیں، کہ اخلاق کے نشو ونما کے خلاف ایک مسموم فضا پھیل جائے،

حصول ملکیت کے ساتھ خاندانی زندگی بھی افراد کے امکان کو حقیقت بنانے کی کوشش کے نتیجہ پر مبنی ہے، اپنی بہبودی کے تخیل کو حقیقت بنانے کے ساتھ ہی ان کی بھی بہبودی مدنظر ہوتی ہے، جو ازدواجی تعلق سے منسلک رہتے ہیں، اس کے ذریعہ اپنے اور دوسروں کی بہتری کا خیال ایک ساتھ وابستہ رہتا ہے، لیکن خانگی زندگی اس وقت تک ناممکن ہے، جب تک زن وشو اپنے وجود کو ایک دوسرے میں جذب نہ کرلیں، اور ایک روح دو قالب نہ ہوجائیں، اسی لئے شادی کی نوعیت تعدد ازدواج پر نہیں، بلکہ وحدت ازدواج پر مشتمل ہونی چاہئے، شوہر کا حق بیوی پر اور بیوی کا حق شوہر پر ایک ایسا حق ہے، جو دوسرے تمام حقوق پر مرجح ہے، اس حق سے ایک مخصوص فرد ایک خاص کردار کا پابند ہوجاتا ہے، جس کا خواہاں کوئی اور ہرگز نہیں ہوسکتا، وحدت ازدواج اسلئے بھی ضروری ہے، کہ اولاد پر والدین وہی حقوق جتا سکیں، جو والدین پر اولاد جتاتی ہے، پھر خانگی تربیت اسوقت تک نہیں ہوسکتی، جبتک ماں اور باپ اپنی اولاد پر یکساں طور پر اقتدار قائم نہ رکھیں، اور اولاد دونوں سے مساوی طور پر محبت نہ کرے، متاہل زندگی کا تخیل یہ ہے، کہ زن وشو زندگی بھر ایک دوسرے کی رفاقت اور غمگساری کریں، نہ کہ محض لطف اور مسرت کے ختم ہونے کے ساتھ ہی علحدگی اختیار کرلیں، اسی لئے ریاست شادی کے رشتہ کو جتنا بھی مستحکم کرسکے کرے،

گرین نے تمام زور افراد کے اخلاقی پہلو پر صرف کیا ہے، اسنے انسان اور خدا کے روحانی رشتے پر بھی بحث کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اپنی اس بحث سے کوئی چیز واضح نہ کرسکا ہے، پھر بھی وہ اپنے مشترکہ شہریت کے نظریہ سے انیسویں صدی کے آخری ربع میں بہت مقبول ہوا، اسکے خیالات نے جماعتی امتیازات بڑی حد تک دور کئے،[1]

[1] PRINCIPLES OF POLITICAL OBLIGATION BY T. GREEN-1 CALCUTTA REVIEW -۲. DUNNING. S POLITICAL THEORIES-۲

زریاب

اسلامی دنیا کا نامور مغنّی

اور

مغربی وضع اور فیشن کا اوّلین موجد

از

جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی

مسلمانوں کی فتح کے بعد سے ملک اندلس تہذیب و تمدن کا مرکز بنگیا تھا، جہاں باکمال اہل فن اور علماء و فضلاء کی سرپرستی اور قدردانی نے مشرق کے باکمالوں کو اس مغربی خطہ کے سلاطین اور خلفاء کے درباروں میں کھینچ بلایا، چنانچہ علماء، ادباء، شعراء اور اہل فن بکثرت عازم اندلس ہوئے، مورخ مقری نے اپنی ضخیم تاریخ نفح الطیب میں "الوافدین علی الاندلس" کے عنوان سے ان کے حالات میں ایک مستقل باب لکھا ہے، مشرق قریب[1] انہی اندلس جانے والوں میں بغداد کا ایک گمنام مغنی زریاب بھی تھا جس نے اندلس پہنچکر نہ صرف اپنے کمال فن سے مغربی دنیا کو محو حیرت بنادیا، بلکہ اپنی نت نئی ایجادات اور مفید اختراعات، جدید اوضاع و اطوار، اور خوش آئند عوائد رسمیہ سے اندلس کی تہذیب کو چار چاند لگا دئے، اور یہ اسی کا پرتو فیض تھا جس نے یورپ کے تمدن پر گہرا اور پائدار اثر ڈالا،

نام اور وجہ تسمیہ، خلیفہ مہدی عباسی (۱۵۸ھ تا ۱۶۹ھ) کا پروردہ[2]، نام علی بن نافع، کنیت ابوالحسن اور لقب

[1] کتاب بغداد مصنفہ احمد بن ابی طاہر طیفور ص ۲۶۳ طبع جرمنی،

زریاب تھا، بقول صاحب مقتبس[1] خوش آوازی، فصاحت اور سانولی رنگت کے لحاظ سے اسکو "زریاب" کہتے تھے، کیونکہ زریاب نام ہے، ایک کالی چڑیا کا جو بہت خوش آواز ہوتی ہے، الدمیری نے زریاب کے معنی "الوزریق" لکھے ہیں، یعنی نیلکنٹھ[2]،

زریاب ہارون رشید کے دربار میں، شاعری اور موسیقی میں زریاب ید طولیٰ رکھتا تھا، خصوصًا عود بجانے میں اس کو کمال حاصل تھا، گانے بجانے میں وہ بغداد کے مشہور مغنی اسحاق الموصلی[3] کا شاگرد تھا، اسحاق ایک زبردست ماہر علوم و فنون اور دربار خلافت میں باریاب تھا، کہتے ہیں، کہ اسی نے زریاب کو بغداد سے نکلوایا، اس کا قصہ یوں ہے کہ ایک مرتبہ اسحاق نے ہارون الرشید کے سامنے اپنے اس شاگرد کا تذکرہ کیا، اور اس کے گانے بجانے کی بہت تعریف کی، اس پر ہارون نے اسکو لانے کی فرمائش کی، چنانچہ جب زریاب دربار خلافت میں حاضر ہوا، تو خلیفہ نے اس سے گفتگو کی، اور اوس نے شایستگی کے ساتھ ہارون کے سوالات کا جواب دیا، جب گانے کے متعلق اس سے پوچھا گیا، تو اس نے کہا کہ جو کچھ تعریف کیجائے، اس سے بھی اچھا گا سکتا ہوں، اور اکثر میں جس گانے کو پسند کرتا ہوں وہ لوگوں کو پسند نہیں ہوتا، البتہ حضور اوسکی داد دیسکتے ہیں، اگر حکم ہو تو ایسا گانا سناؤں، جو حضور نے پہلے کبھی نہ سنا ہوگا، اس پر ہارون نے گانے کی فرمائش کی، چنانچہ اس کے استاد اسحاق کا عود (ساز) منگوایا، اور اس کو دیا گیا، تو زریاب نے اس کے لینے میں تامل کیا، اور کہا کہ "میرا اپنا عود ہے، جسکو میں نے اپنے ہاتھ سے تیار کیا ہے، اور اپنی عقل و رائے کے مطابق ترتیب دیا ہے، اس کے سوا میں کسی دوسرے کا عود نہیں پسند کرتا، وہ دروازہ پر رکھا ہوا ہے، اگر حضور حکم دیں تو لایا جائے" چنانچہ رشید کے حکم سے وہ لایا گیا، اور دیکھا تو اس کے اگلے عود سے مشا[بہ تھا،] رشید نے زریاب سے کہا کہ "تم نے اپنے استاد کا عود استعمال نہیں کیا، اسکی کیا وجہ ہے؟" زریاب نے عرض کی، کہ اگر حضور کو

[1] نفح الطیب للمقری ج ۲ ص ۱۰۹ (طبع مصر) [2] حیوٰۃ الحیوان جلد ۲ ص ۹ مصر،

[3] اسحاق بن ابراہیم موصلی، ہارون الرشید کا مصاحب اور ندیم خاص، اس کے مفصل حالات کے لئے دیکھو کتاب الاغانی ابن خلکان، وغیرہ، [4] ابن عبدربہ (عقد الفرید جلد ۴ ص ۱۱۰ مصر) نے اسحاق کے بجائے اسکے باپ ابراہیم کا نام لکھا ہے جو یقینًا غلط ہے

میرے استاد کا گانا سننے کی خواہش ہو تو انہی کے عود پر سناؤں، اور اگر میرا گانا سننا منظور ہو، تو میں اپنے عود پر گاؤں،
اگرچہ میرا عود جسامت میں اسی عود کے برابر اور ایک ہی قسم کی لکڑی سے بنا ہوا ہے، لیکن یہ وزن میں اس سے
حصہ کے برابر ہے، میرے عود کے تار ریشم سے بنائے گئے ہیں، جو گرم پانی میں ڈالکر بٹے گئے ہیں، جس سے ان کی کمی
اور بل دور ہو گیا ہے، اس کا مثلث تار بچہ شیر کی آنتوں سے بنایا گیا ہو، جسکی وجہ سے اسمیں ترنم، صفائی، گونج اور
زیادہ ہو گئی ہے، جو دوسرے سازوں میں کم پائی جاتی ہیں، وغیرہ" اس کے بعد ہارون نے گانے کا حکم دیا، چنانچہ
اس نے عود پر یہ گانا گایا:-

یا ایھا الملک المیمون طائرہ ہارون راح الیک الناس وابتکروا

اے مبارک چہرے والے بادشاہ ہارون! لوگوں کے صبح و شام تیرے پاس آنیکا سلسلہ لگا ہے،
اس کے گانے سے ہارون الرشید وجد میں آگیا، اور اسحاق سے کہنے لگا،" مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تم نے قصداً
اسکے گانے کا حال مجھ سے چھپایا، اور پہلے تم نے اس کا گانا نہیں سُنا، اگر تصدیق نہ کرتے تو میں ضرور تمہیں سزا دیتا،
اب اسے اپنے پاس رکھو، اور اسکی تعلیم کی طرف توجہ کرو، اور جب میں فرصت میں ہوں، تو اسے دوبارہ میرے
پاس لاؤ، کیونکہ مجھے اس سے بہت دلچسپی ہے"، اس واقعہ سے اسحاق کے دل میں زریاب کی طرف سے آتشِ حسد بھڑک اٹھی
اور ایک دن اس نے زریاب کو تنہائی میں یوں مخاطب کیا،

"دیکھو اے علی! حسد سب سے بڑا اور بدترین مرض ہے، دنیا جائے فتنہ اور باہم شگی عداوت کا باعث
ہے، تم نے اپنے کمالِ فن کو چھپا کر میرے ساتھ فریب کیا، اور اپنا فائدہ حاصل کرنا چاہا، اور میں ایسے
ادنیٰ کام پر اتر آیا، کہ تمھیں خلیفہ کے حضور میں پیش کر دیا، مجھے معلوم ہے کہ تھوڑے عرصہ میں تم میری
وقعت گھٹا دوگے، اور مجھ سے تمہارا رتبہ بلند ہو جائیگا، لہذا آیندہ سے میں تم کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتا، خواہ
تم میری اولاد کے برابر کیوں نہ ہو، اور اگر تمھاری تربیت میرے ذمہ نہ ہوتی تو میں تمھاری جان لینے میں
کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتا، پھر خواہ اسمیں کچھ ہی کیوں نہ ہو جاتا، اب تم کو دو باتوں میں سے ایک پسند کرنی ہی

پڑے گی، اگر یا تو یہ پختہ عہد و پیمان کرو کہ تم میرے پاس سے اس وسیع دنیا میں کسی ایسی جگہ چلے جاؤ کہ
جہاں سے مجھے پھر تمہارا حال معلوم نہ ہو سکے، اور جو کچھ مال و اسباب کی ضرورت ہو وہ میں تم کو دینے
کیلئے تیار ہوں، اور اگر میری مرضی کے خلاف میرے مخالف بنکر یہاں ٹھہرنا چاہتے ہو، تو میری مخالفت سے
ہشیار رہو کیونکہ میں اپنی جان اور مال سے تم کو تباہ و برباد کرنے کے درپے رہونگا،"

زریاب اسحاق کے مرتبہ اور اس کے رسوخ سے واقف تھا، اس لئے اوس نے وہاں سے نکل جانے
کو ترجیح دیا، چنانچہ اسحاق نے فوراً اوسکو وہاں سے نکل جانے میں مدد کی اور وہ راتوں رات بغداد سے روانہ
ہو گیا، جس سے اسحاق کے دل کو تسکین ہو گئی، مگر جب ہارون نے بوقت فرصت زریاب کو یاد کیا، اور اسحاق
کو اس کے حاضر کرنے کا حکم دیا، تو اس نے عرض کی کہ "امیرالمومنین وہ غلام تو دیوانہ ہے، اسے یہ خبط ہو گیا ہے کہ
جن اس سے باتیں کرتا ہے، اور عمدہ گانے اسکو سکھاتا ہے، وہ اپنے برابر دنیا میں کسی کو نہیں سمجھتا، اور چونکہ حضور
نے اسے پھر یاد فرمایا، نہ انعام و اکرام دیا، اسلئے وہ اپنے فن کی توہین، اور ناقدری کا خیال کرکے غصہ میں مجھ سے
چھپ کر کہیں فرار ہو گیا، اسمیں بھی حضور کیلئے خدا نے بہتری رکھی تھی، کیونکہ اسکو دورے پڑتے تھے، اور حالت دیوانگی
میں وہ بہت خوفناک نظر آتا تھا" ہارون الرشید کو اس بات سے یقین ہو گیا، اور اس نے افسوس کیا کہ خیر جیسا بھی
کچھ تھا، مگر اس سے جو خوشی حاصل ہونے والی تھی، وہ یقیناً مفقود ہو گئی،"[1]

اس واقعہ کے بعد زریاب مغرب کی طرف روانہ ہو گیا، اور اس دن سے مشرق میں اسکے حالات پر گمنامی
کا پردہ پڑ گیا، یہی وجہ ہے کہ مشرق کے مورخین میں سے کسی نے اس کا تذکرہ نہیں کیا، احمد بن طاہر طیفور نے اسکی
نسبت صرف اسقدر لکھا ہو کہ وہ بغداد سے شام کی طرف گیا،[2]

زریاب قیروان میں

ابن عبدربہ نے زریاب کے قیروان پہنچنے کا حال لکھا ہو، کہ وہ خاندان بنو اغلب کے فرمانروا
زیادۃ اللہ بن ابراہیم بن الاغلب (سنہ ۲۰۱ھ- سنہ ۲۲۳ھ) کے دربار میں پہنچا، وہاں ایک دن اوس نے عنترہ (ابوالغوا...

[1] مقری جلد ۲ صفحہ ۱۰۹، ۱۱۰، [2] کتاب بغداد ص ۲۸۴، طبع جرمنی،

کے اشعار ذیل گائے:۔

فان تك امی غرابیة	اگر میری ماں کوے کے رنگ کی ہوتی،
من ابناء حام بها عبتنی،	بنی حام (حبش) کی اولاد میں تو تو مجھے اس پر مطعون کرتا،
فانی لطیف بیبیض الظبا،	میں تلواروں، اور نیزوں میں ماہر ہوں،
وسمر العوالی اذا جئتنی،	جب تو میرے مقابلہ میں آئے،
ولولا فرارك یوم الوغی،	اور اگر لڑائی کے دن تو میدان سے نہ بھاگ گیا
لقد تك فی الحرب اوقدتنی	ہوتا تو میں تجھکو لڑائی میں کھینچتا یا تو مجھے کھینچا،

اس پر زیادۃ اللہ غضبناک ہوگیا، اور زریاب کو کوڑے لگا کر نکال دینے کا حکم دیا، اور کہا کہ اگر تین روز کے بعد میں تجھے اپنے ملک میں دیکھوں گا، تو گردن مار دوں گا، چنانچہ بیچارہ وہاں سے بھاگ کر سمندر کے راستہ سے اندلس پہنچا[1]،

زریاب اندلس میں، مقری نے لکھا ہے کہ زریاب نے اندلس کے فرمانروا امیر الحکم کو ایک خط لکھا جسمیں اس نے اپنے اندلس چلے آنے، اور فنِ موسیقی میں اپنی دسترس کا تذکرہ کیا، اور باریابی کی اجازت چاہی، اس کے جواب میں امیر نے اپنا اشتیاق ظاہر کیا، اور مجلاً اسکی خواہش پوری کرنے کا وعدہ کیا، ساتھ ہی اپنے دربار کے ایک مغنی منصور یہودی کو اسکو لانے کیلئے بھیجا، چنانچہ زریاب اپنے اہل و عیال سمیت آبنائے جبل الطارق سے کشتی میں سوار ہو کر جزیرۃ الخضراء کی طرف روانہ ہوگیا، ابھی وہاں پہنچنے بھی نہ پایا تھا، کہ راستہ میں اسکو الحکم کی وفات کی خبر ملی، تو اوس نے لوٹ جانے کا قصد کیا، مگر منصور نے اسکو روک لیا، الحکم کے فرزند اور جانشین عبد الرحمن کے پاس چلے آنے پر آمادہ کیا، اور امیر کو زریاب کے آنے کی اطلاع دی[2]، اس کے جواب میں عبد الرحمن نے زریاب کے آنے پر اپنی مسرت

[1] عقد الفرید جلد ۴ ص ۱۰۰ مصر [2] ابن خلدون نے (مقدمہ ص ۵۰۴) لکھا ہے، کہ امیر الحکم سواری لیکر زریاب کو لینے کے لئے نکلا، اور بے انتہا انعام و اکرام اور جاگیر دے کر اسے اپنا ندیم خاص بنایا، مگر یہ صحیح نہیں ہے کہ زریاب کے اندلس پہنچنے سے پہلے ہی الحکم کا انتقال ہو چکا تھا،

کا اظہار کیا، مختلف شہروں میں حکام کے نام فرامین جاری کردئے، کہ وہ زریاب کا استقبال کریں، اور عزت و شان کے ساتھ اسکو قرطبہ تک لے آئیں، اور اپنے خواجہ سراؤں میں سے ایک بڑے خواجہ سرا کو سواریاں لیکر بھیجا، چنانچہ زریاب اور اس کے اہل و عیال عزت کے ساتھ قرطبہ میں داخل ہوئے، ایک بہترین مکان میں ان کے فروکش ہونے کا انتظام کیا گیا، اور تین دن تک زریاب کو آرام لینے کی اجازت دی گئی،

زریاب عبد الرحمن کے دربار میں، تین روز کے بعد امیر عبد الرحمن نے زریاب کو اپنے دربار میں باریابی کا شرف بخشا، اسکے لئے اور اسکے اہل و عیال کیلئے حسب ذیل مشاہرے اور وظیفے مقرر کئے:۔

۱۔ زریاب کیلئے ۲۰۰ دینار ماہوار،

۲۔ اس کے چار بیٹوں کیلئے ۲۰،۲۰ دینار ماہوار،

۳۔ سالانہ ۳۰۰۰ دینار،

یعنی عیدین پر ہزار ہزار اور مہرجان و نوروز پر پانسو پانسو دینار،

۴۔ سالانہ خوراک کیلئے ۳۰۰ مد اناج (تقریباً ۱۵ من پختہ) جسمیں ۱۰ من جو اور ۵ من گیہوں،

۵۔ چند قطعات اراضی، باغات، باڑیان وغیرہ جنکی آمدنی چالیس ہزار دینار تھی،

جب امیر نے زریاب کی تمام ضروریات زندگی کا انتظام کر کے ان کو مہیا کرنے کا عہد کر لیا، اور یہ معلوم کر کے کہ وہ ان وظائف اور عطیات پر راضی ہوگیا ہے، تب اسکو اپنی مجلس نبیذ میں بلوا کر گانا سنا، امیر نے زریاب کا گانا سننے کے بعد دوسرے مغنیوں کا گانا سننا ترک کر دیا، اور وہ اس کو بجد چاہنے لگا، خلوت میں اسکی تعظیم و تکریم کرتا رہا، اور اسکی توقیر بڑھاتا رہا، اور جب اوس نے سلاطین اور خلفاء کے حالات اور اہل علم کے نوادر میں گفتگو کی، تو زریاب کو معلومات کا ایک بحر زخار پایا، امیر اسکی باتوں کو سنکر محوِ حیرت ہوگیا، کھانے کے وقت زریاب اور اس کے بڑے بیٹے کو امیر اپنے ساتھ دسترخوان پر بٹھا کر کھلاتا، زریاب سے اسکو اس قدر محبت ہوگئی تھی، کہ اسکے لئے امیر نے محلسرا میں ایک مخصوص دروازہ بنا دیا تھا، کہ جسوقت وہ چاہتا زریاب کو اس راستہ سے بلا لیتا،

زریاب کی مہارت علمی وفنی

زریاب کو نہ صرف موسیقی میں دسترس حاصل تھی، بلکہ وہ فن نجوم اور جغرافیہ طبیعیات کا بھی
عالم تھا، چنانچہ تقسیم اقالیم سبعہ، اختلاف طبائع، دریاؤں کے علٰحدہ ہونے، شہروں کے بسنے، وغیرہ امور کی نسبت
بہت وسیع معلومات رکھتا تھا، موسیقی میں دس ہزار گانوں کے مقطوعات (آثار چڑھاؤ اوران کے قسم) اسکو
ازبر تھے، علاوہ بریں ادب وشاعری میں بھی اسکو پورا دخل تھا، حسن معاشرت، عوائد رسمیہ، سلاطین کی ہمنشینی
مصاحبت وغیرہ کے آداب اور طور طریقوں سے بخوبی واقف تھا،

زریاب کا اندلس میں موسیقی کی تعلیم پھیلانا

زریاب سے پہلے بھی اندلس میں موسیقی کا چرچا تھا، چنانچہ امیر عبدالرحمٰن الداخل کے عہد میں
اون کے بعد بھی سلاطین اندلس کے درباروں میں موسیقی کا رواج برابر جاری رہا، ابو الحکم
(اول) کے دربار میں عباس بن نساعی، منصور یہودی، علون، اور زرقون مشہور گویے تھے، مگر زریاب کے اندلس
جانے کے بعد سے موسیقی کا شوق انتہا کو پہنچ گیا، اور لوگ اوس کے طرز غنا کے ایسے دلدادہ ہوگئے، کہ ان کی
گویوں کو بھول گئے، زریاب کے اندلس پہنچنے سے اس فن نے بڑا فروغ پایا، اور لوگ موسیقی کی تحصیل کیلئے اسکے
پاس آنے لگے، مورخ مقری نے زریاب کی تعلیم موسیقی سے متعلق حسب ذیل معلومات مہیا کی ہیں، :-

اندلس میں ہمیشہ گانا سکھانے کا یہ طریقہ مروج تھا کہ پہلے مبتدی سے بلند آواز میں اشعار گوائے جاتے
تھے، اسکی ابتدا البسیط (لے) سے ہوتی تھی، اور ہزج (سادہ گیت) پر اسکو ختم کرایا جاتا تھا، یہ زریاب کے
طریقہ کی پیروی تھی، وہ جب کسی شاگرد کو گانا سکھاتا تو اولاً اسکو ایک گول چمڑے کی گدی پر (جسکو مسورہ کہتے ہیں)
بٹھاتا، اور اگر اوسکی آواز بلند ہوتی، تو اُسے زور سے آواز نکالنے کو کہتا، اور اگر اوسکی آواز پست ہوتی، تو اس کے پیٹ
پر خوب کس کر پگڑی بندھواتا جس سے اوسکی آواز بلند ہوجاتی، اور الاپ نکالنے میں پیٹ نہ بیٹھتا، پھر اگر اس کے
دانت ملے ہوئے ہوتے، اور وہ اپنا منہ اچھی طرح نہ کھول سکتا، یا بولتے وقت دانت بھینچنے کا عادی ہوتا، تو اسے تاکید
کرتا، وہ رات کو سوتے وقت تین انگشت کا ایک لکڑی کا ٹکڑا اپنے منہ میں رکھا کرے، تاکہ اس کے جبڑے کھل جائیں
پھر اس شاگرد کی سریلی آواز کا امتحان کرنا چاہتا، تو اس سے کہتا کہ وہ اپنی بلند ترین آواز میں "یا حجام" یا "آہ" کہے

کھینچے، پھر اگر اسکی آواز صاف اور بلند ہے، تنگ یا دبی ہوئی نہیں ہوئی ہے، تو معلوم کرلیتا کہ اس میں گانا سیکھنے کی صلاحیت
ہے، ورنہ بصورت دیگر اسکو رخصت کردیتا،

زریاب کا کمال فن اور ایجادات موسیقی

فن موسیقی میں زریاب کو جو ید طولیٰ تھا، اس کا اندازہ خود اس کے استاد اسحاق موصلی کے
ساتھ گذرے ہوئے واقعہ سے ہوسکتا ہے، غالبًا اس کے کمال فن کی بنا پر یہ عجیب روایت
مقری نے نقل کی ہے، کہ زریاب اس بات کا مدعی تھا، کہ ہر شب کو خواب میں ایک جن اس کے پاس آتا ہے،
اور کوئی راگ اسکو سکھا جاتا ہے، چنانچہ وہ فوراً نیند سے اٹھ بیٹھتا اور اپنی دو کنیزوں غزلان اور ہنیدہ کو پکارتا،
وہ اپنا اپنا عود لئے ہوئے آتیں، یہ اپنا عود اٹھا لیتا، کوئی گت بجاتا، اس کے بعد کچھ اشعار لکھتا، اور پھر فوراً
سوجاتا،[1] یہ واقعہ صحیح ہو یا غلط، لیکن اکثر دیکھا گیا ہے، کہ جب کسی آدمی کو کسی خاص فن سے شغف اور مزاولت ہوتی
ہے، تو وہ خواب میں بھی وہی کام کرتا رہتا ہے، اور بعض اوقات خواب میں اپنے فن سے متعلق کوئی نئی بات
معلوم کرکے اٹھ بیٹھتا ہے، اور اسکو عمل میں لانے کی تدبیر کرتا ہے، خود اس کا استاد ابراہیم موصلی بھی اسی بات
کا مدعی تھا، کہ جن اسکو موسیقی کی تعلیم دیتا ہے، بہرحال عقلاً یہ واقعہ مستبعد نہیں معلوم ہوتا، زریاب کے حافظہ
کے متعلق ہم اوپر لکھ چکے ہیں، کہ دس ہزار گانوں کے مقطوعات اسکو حفظ تھے، مگر زریاب نے راگ راگنی کے
سلسلہ میں کیا کیا اضافے کئے، اسکی تفصیل سے ہم محروم ہیں، صرف اسقدر معلوم ہوسکا ہو کہ مشہور اندلسی شاعر وادیب[2]
ابو الحسن اسلم بن احمد نے اسکے گانوں کو جمع کرکے "اغانی زریاب" کے نام سے کتابی صورت میں قلمبند کیا تھا، جواَب مفقود ہے
علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں، کہ اندلس میں زریاب کی موسیقی کا رواج طوائف الملوکی کے زمانہ تک
رہا، خصوصًا اشبیلیہ میں اس کا بہت چرچا رہا، اور جب اشبیلیہ کی رونق زوال پذیر ہوئی تو اس فن کے ماہرین وہاں
سے نکل کر مغرب وافریقیہ میں پہنچے، اور تمام ملک میں پھیل گئے،[3]

[1] اوپر کی تفصیلات مقری (ج ۲ ص ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲) سے ماخوذ ہیں، [2] معجم الادباء للیاقوت جلد ۲ صفحہ ۲۳ و ۶۹، یاقوت کا بیان ہے
کہ ابو الحسن اسلم نے زریاب کے ترتیب دئے ہوئے راگوں پر متعدد کتابیں لکھی ہیں، [3] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۰۵ طبع بولاق،

زریاب کو نہ صرف گانے میں کمال حاصل تھا، بلکہ ساز بجانے میں بھی وہ یکتائے روزگار تھا، جیسا [illegible]
ہم ابتدا میں اسکو خلیفۂ بغداد کے دربار میں دیکھ چکے ہیں، وہ اپنے جس مخصوص عود پر گاتا تھا، اس کی [illegible]
ہم معلوم کر چکے ہیں، عام سازوں کے خلاف اس کے عود میں کتنی زائد خوبیاں تھیں، اسی طرح اندلس [illegible]
اس نے اس ساز (عود) میں ایک پانچویں تار کا اضافہ کیا جو اس کا ایک اہم کارنامہ سمجھا جاتا ہے، اسکی تفصیل [illegible]
مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ پہلے عود کا مختصر حال بیان کیا جائے :-

اہلِ عرب کے ہاں گانے کیلئے عموماً تمام سازوں کی نسبت عود زیادہ مستعمل تھا، اسی کو بربط[1] [illegible]
اور مزہر بھی کہتے تھے، مورخ مسعودی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ ابتدا میں عربوں کا گانا بغیر ساز [illegible]
ہوتا تھا، پھر جب نضر بن حارث کسریٰ کے دربار میں بمقام حیرہ پہنچا، تو وہاں اس نے عود پر گانا سیکھا [illegible]
جب مکہ آیا تو اس نے وہاں کے لوگوں کو سکھا دیا، اس دن سے حجاز میں عود کا رواج ہوا[2]، لیکن اصفہانی
لکھتا ہے، کہ ۶۴ھ میں جب حضرت عبداللہ بن زبیرؓ خانہ کعبہ کے تعمیری کاموں کیلئے ایرانی غلاموں [illegible]
تو ان کے ذریعہ سے ابن مسریج نے عود فارسی (بربط) حاصل کیا، اور یہ پہلا شخص ہے جس نے مکہ میں اس
پر عربی گانا گایا[3]، یہ عود عباسی عہدِ حکومت کی ابتدائی نصف صدی تک مروج اور مقبول رہا، پھر ہارون [illegible]
کے درباری مغنی زلزل نے "عود الشبوطی" (ایک قسم کی مچھلی "شبوطی" سے مشابہ) ایجاد کیا، جسمیں اوپر کا [illegible]
(جہاں انگلیاں رکھکر بجاتے ہیں،) بہ نسبت اس کے بطن کے زیادہ چوڑا تھا، مگر اس پر پہلے کی طرح وہی [illegible]
تار تھے، عود فارسی کے بعد بھی عود زیادہ تر مستعمل رہا، بقول مورخین مسعودی[4]، و مقری[5] یہ چار تار اخلاط [illegible]
کی مناسبت سے رکھے گئے تھے، ان تاروں میں زیر کا تار خلط صفرا، کی مناسبت سے زرد رنگ کا، دو [illegible]
تار جو ثانی میں دوگنا ہونے کی وجہ سے مثنیٰ کہا جاتا ہے، اور زیر کا مدھم ہوتا ہے، وہ دم (خون) [illegible]

[1] عقد الفرید جلد ۳ ص ۱۳۰، [2] مروج الذہب برحاشیہ ابن اثیر جلد ۱ صـ ۲۳، [3] اغانی جلد ۱ ص ۹۸، [4] مروج الذہب برحاشیہ ابن اثیر جلد ۱ صـ ۲۲، [5] نفح الطیب جلد ۲ صـ ۱۱۱،

مناسبت سے سُرخ رنگ کا، تیسرا تار بے رنگ کا یعنی سفید ہوتا ہے، جو بمنزلہ بلغم کے ہے، اور مثنیٰ کا مدھم ہے،
اسکو مثلث کہتے ہیں، اور چوتھا تار سودا کی مناسبت سے سیاہ رنگ کا ہوتا ہے، جسے بم کہتے ہیں، اور یہ
[illegible] بلند ترین تاروں میں سے ہے، اور مثلث تار کا مدھم ہوتا ہے، یہ چاروں تار چاروں خلطوں کے مقابل اسلئے
[illegible] گئے، تاکہ انسانی طبیعتوں کو اعتدال پر رکھیں، اس لحاظ سے بم گویا گرم و خشک بمقابلہ مثنیٰ کے ہے، جو گرم تر
[illegible] جس سے وہ بم کو مساوی رکھتا ہے، جسطرح جسم اخلاط کے اعتدال سے، اب اسمیں ایک چیز یعنی نفس یا قلب کی کمی
[illegible] اور چونکہ وہ دم سے بالکل متصل ہے، اسلئے زریاب نے ایک پانچواں تار "اوسط دموی" کے نام سے اضافہ کیا، اس
[illegible] مناسبت سے اس کا رنگ سُرخ رکھا، اور اسکو مثلث کے نیچے اور مثنیٰ کے اوپر رکھا،

اس سلسلہ میں زریاب کی ایک اور ایجاد قابلِ ذکر بھی ہے کہ اس نے اندلس پہنچ کر عقاب کے پنجہ کے ناخنوں
(قوادم) سے عود کا مضراب بنایا، بجائے لکڑی کے مضراب کے اسمیں یہ خوبی تھی، کہ وہ سبک ہونے کے لحاظ سے
انگلیوں پر ٹھیک بیٹھتا تھا، اور بکثرت عود بجانے میں تار بھی ٹوٹنے سے محفوظ رہتے تھے،

زریاب کی تمدنی اور معاشرتی اختراعات

زریاب نے اندلس پہنچکر وہاں کی طرزِ معاشرت اور تمدن میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا،
اوس کی اختراعاتِ مفیدہ کی فہرست بہت طول و طویل ہے، جس کو ہم مجملاً مقری سے اخذ
کر کے درج ذیل کرتے ہیں :-

۱۔ اوس نے مختلف اقسام کے ظروف اور برتن ایجاد کئے، پہلے اندلس میں سونے چاندی کے ظروف مستعمل تھے
زریاب نے اکثر شیشے کے برتنوں کا استعمال رائج کیا،

۲۔ طرزِ معاشرت، ملاقات اور میل جول میں خوشگوار تبدیلیاں کیں،

۳۔ پہلے اندلس میں یہ فیشن تھا کہ مرد اور عورتیں بیچ سر میں مانگ نکالا کرتے تھے، زریاب نے بالوں
کو کٹوا کر ٹیڑھی مانگ نکالنے کا فیشن ایجاد کیا، یہ طرز اہلِ اندلس کو بہت پسند آیا، اور سب لوگ اسی طرز
پر بال بنانے اور مانگ نکالنے لگے،

۴۔ بغل کی بدبو رفع کرنے کیلئے مُرداسنگ (غالباً سنگ جراحت یا چاک مٹی) سے مرتک (غازہ) بنا،
اہل اندلس نے اسی سے سیکھا، ورنہ اس سے پہلے امرائے اندلس گلاب اور ریحان کے پھولوں کا سفوف اور
اس قسم کی سرد اور قابض ادویہ استعمال کرتے تھے، مگر اوس سے ان کے کپڑے میلے ہوجاتے تھے، اس کیلئے زریاب
نے ایک قسم کا نمک تجویز کیا، (غالباً سوڈا) جس سے کپڑے صاف ستھرے دُھلنے لگے،

۵۔ سب سے پہلے زریاب ہی نے ہلیون نام کی ترکاری کا استعمال بتایا جسکو انکی زبان میں اسفراج کہتے
ہیں، اس سے پہلے اندلس والے اس ترکاری سے واقف نہ تھے، یہ اسفراج وہی اسپیراگوس ASPARAGUS
ہے جو آج کل اہلِ یورپ کی بہت مرغوب ترکاری اور جس کے بغیر کوئی ڈنر خالی نہیں ہوتا، عموماً ڈبون میں
بند ہوکر مختلف ممالک میں بھیجی جاتی ہے،

۶۔ اندلس میں کئی قسم کے کھانے اور پکوان زریاب کے نام سے منسوب ہیں، ایک قسم کا پکوان جسکو تفایا
کہتے ہیں، وہ زریاب ہی سے منسوب ہے، یہ سبز دھنیے کے پانی سے بنتا تھا، اور سنبوسہ اور کباب کی طرح بنا
جاتا تھا، اسی طرح ایک پکوان تقلیہ ہوتا تھا، جو زریاب سے منسوب ہے، آج بھی عربی میں اسکو "تقلیۂ زرلابیہ" کہتے
ہیں، جو دراصل زریابیہ کی خرابی ہے[1] ہمارا خیال ہے، کہ ہندوستان کی مشہور مٹھائی جسکو ہم "جلیبی" کہتے ہیں دراصل
زریاب ہی کی نسبت سے موسوم ہے، اور زریابیہ سے بگڑکر "زرلابیہ" اور جلیبی ہوگئی ہے،

۷۔ اندلس میں پہلے لکڑی کی چوکیوں (غالباً میزوں) پر کھانا کھایا جاتا تھا، زریاب نے اس پر چمڑے
کا دسترخوان بچھانے کو رواج دیا کہ اگر وہ میلا ہوجائے تو ذرا سا گھسنے سے صاف ہوجایا کرے،

۸۔ ہر موسم کے مطابق کپڑے پہننے کا رواج اندلس میں زریاب ہی کی بدولت ہوا، پہلے وہاں کے
لوگ تین مہینوں تک یعنی مہرجان (جس کو وہ عنصرہ کہتے تھے، اور جو شمسی سال کے ماہ جون کی ۲۴ کے مطابق
تھا) سے لیکر کم اکتوبر شمسی تک سفید کپڑے بلا رنگ کے پہننے کے عادی تھے، اور باقی سال بھر رنگین کپڑے

[1] دائرۃ المعارف البستانی جلد ۹ صفحہ ۲۲۱۔

پہننے کا رواج تھا، زریاب نے انہیں حسب ذیل تغیر کیا:۔

(۱) ربیع یا موسم بہار میں رنگین کپڑے، مثل نیم ریشمی، اور حریر کے جبے، اور کرتے پہنے جائیں جو بغیر
استر کے ہوں،

(ب) خریف یا موسم خزاں کے آغاز میں دھاری دار چادریں، اور یک رنگے ہلکے اور سبک کپڑے پہنے
جائیں، جو رنگین اور استر والے ہوں،

(ج) جاڑے کے موسم میں زیادہ گرم اور رنگین کپڑے ہوں، اور بوقت ضرورت ان کے نیچے
"فرا"[1] پہنے جائیں،

زریاب کا رسوخ اور دخل امیر عبدالرحمن کے مزاج میں

جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں، زریاب کو کمالِ فن کی بنا پر امیر کے مزاج میں بہت دخل
تھا، اسی لئے رعایا میں سے جو لوگ حکمراں تک اپنی معروضات پہنچانا چاہتے تھے،
وہ زریاب کے نام عریضے لکھ کر پیش کرتے تھے، لیکن اوس نے کبھی سیاسی معاملات میں دخل در معقولات نہیں
دیا، کیونکہ حکومت کے معاملات میں پڑنا، اور سیاسی ریشہ دوانیوں میں شریک ہونا زریاب جیسے صاحبِ فن
لطیف کیلئے ایک کھلی ہوئی بدمذاقی کا ثبوت تھا،

زریاب کی وفات

اگرچہ زریاب کا سالِ وفات مقری یا کسی اور مؤرخ نے بیان نہیں کیا، لیکن معلوم ہوتا ہے
کہ امیر عبدالرحمن کے بیٹے محمد کے عہدِ حکومت (۲۳۸ھ۔ ۲۷۳ھ) سے پہلے ہی وفات پاچکا تھا، معلوم ہوتا ہے
کہ زریاب نے عمر طویل پائی، کیونکہ وہ خلیفۃ المہدی عباسی کے (جو ۱۵۸ھ میں تخت نشین اور ۱۶۹ھ میں فوت ہوا)
غلاموں میں سے تھا، اور مہدی کے عہد سے لیکر امیر عبدالرحمن کی وفات تک جو ۲۳۸ھ میں واقع ہوئی، "استی"

[1] اسی کو فرا (FIRS) کہتے ہیں، اندلس کے بحر محیط (اطلانطک) میں جزیرۂ برطانیہ کی طرف ایک جانور نیولے کا سا
ہوتا ہے، جس کو سمور کہتے ہیں، اسے پکڑ کر سرقسط لیجاکر اوس کی پشم سے فر بناتے تھے، (مقری جلد ا ص ۹۲) آج کل اکثر یورپین
لیڈیاں اسکو گلے میں ڈالے رہتی ہیں،

برس ہوتے ہیں، اس سے قیاس ہوسکتا ہے، کہ اوس نے تقریبًا ۸۰ برس سے زائد عمر پائی ہوگی، بقول مقری[1] زریاب

۲۰۶ھ میں اندلس آیا، اس حساب سے تقریبًا تیس بتیس سال اس نے اندلس میں گذارے،

اولاد، زریاب نے اپنے پیچھے کئی اولادیں چھوڑیں، اوس کے آٹھ بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں، جنکے نام حسب ذیل ہیں،

۱۔ عبدالرحمٰن، (۲) عبیداللہ، (۳) یحیٰی، (۴) جعفر، (۵) محمد (۶) قاسم، (۷) احمد، (۸) حسن،

لڑکیوں میں:۔ (۱) علیة، اور (۲) حمدونہ،

یہ سبکے سب فنِ موسیقی کے ماہر تھے، ان میں عبیداللہ سب سے زیادہ ماہر فن تھا، اس سے دوسرے نمبر پر عبدالرحمٰن تھا، لیکن وہ غرور اور بدمزاجی کی وجہ سے بہت بدنام تھا، حمدونہ کی شادی وزیر ہشام بن عبدالعزیز سے ہوئی تھی،

زریاب کی قدر و منزلت، اسلامی دنیا کے نامور مشاہیر میں زریاب کا بھی شمار ہوتا ہے، اور اگرچہ بغداد سے گمنام حالت میں اندلس چلے آنے کے باعث زریاب کے ذکر سے مشرق قریب کی تواریخ خاموش ہیں، لیکن غنیمت ہے کہ المقری کی مبسوط تاریخ میں اس کا تذکرہ موجود ہے، اسکی قدر و منزلت ہماری نظروں میں اس لحاظ سے بہت بڑھجاتی ہے کہ وہ اس عہد کا ایک مشہور صناع (ARTIST) تھا، جس نے مغرب کو فنون لطیفہ، تنعم (LUXURY) اور رسم و رواج و معاشرت کے آداب اور طریقوں سے آشنا کیا، اور جسکے آثار اب بھی مغربی دنیا کی وضع اور فیشن میں جلوہ گر ہیں، بقول امریکن مصنف اسکاٹ مذہب اسلام میں نامور پرستی اور اشیاء پرستی کی ممانعت ہے، ورنہ کسی اور قوم میں زریاب جیسا باکمال پیدا ہوتا، تو لوگ اوس کے سنگی اور برنجی مجسمے تیار کرتے،

طبقات الامم

اسمیں اندلس کے نامور فاضل قاضی صاعد نے اپنے زمانہ تک کی تمام قوموں خصوصًا مسلمانوں کی علمی وادبی تصانیف اور علوم کی تاریخ لکھی ہے، ضخامت ۱۵۰ صفحے قیمت، ۱۲

"مینیجر"

[1] نفح الطیب جلد اول ص ۱۰،

گلِ ملتانی

از

جناب اسد ملتانی بی اے،

مخدومِ محترم!

السلام علیکم:۔ مزاجِ گرامی، اس دفعہ اکتوبر اور نومبر کے معارف میں چند باتیں نظر آئیں، جنکے متعلق اظہارِ خیال ضروری معلوم ہوتا ہے،

ایک وزن عروضی سب سے پہلے تو پرفیسر تاثیر کے "نامۂ کیمبرج" میں عروض کی جو بحث اٹھائی گئی ہے، اس کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے، عمارہ مروزی کے چار مصرعوں کے متعلق جناب تاثیر کا یہ کہنا تو واقعی صحیح نہیں، کہ وہ "مستفعلن مفاعلن" کے وزن پر ہیں، یہ وزن تو نہ بحر رجز میں ہے، نہ رمل میں، لیکن چوتھے مصرعہ کے عروضی سقم پر اُن کا اعتراض بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے، چاروں مصرعوں کو بحر مضارع کے وزن "مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن" پر ہونا چاہیے، آپنے پہلے مصرع کی تقطیع تو ٹھیک اسی کے مطابق کر دکھائی ہے، مگر چوتھے مصرع کی مطابقت "مفعول فاعلاتن مفاعیل فاعلن" سے کردی ہے، جو اصل وزن سے مختلف ہے،

تاریخ و حالاتِ ملتان سفرنامۂ افغانستان کے سلسلہ میں آپکے قلم سے ملتان کے حالات پڑھکر خوشی ہوئی، دعوت تو آپ کو افغانستان کی طرف سے ملی، مگر قسمت ملتان کی جاگی، کہ اسکی تاریخ کے متعلق آپ نے اتنی معلومات یکجا کردیں، جتنی کہ تمام سفرنامہ میں خود افغانستان کے غالبًا کسی ایک شہر کے متعلق فراہم نہیں کی گئیں، خیر ملتان کو بھی اس سلسلہ میں خاص حق تھا، کیونکہ یہ بھی ایک عرصہ دراز تک افغانوں کی آزاد سلطنتوں کا دارالحکومت

رہا ہے، کچھ مدت خود افغانستان کے ایک صوبے کی حیثیت بھی اسے حاصل رہی ہے، نیز اب تک ہندوستان میں افغانوں کا غالباً سب سے بڑا مرکز ہے، چنانچہ ملتِ افاغنہ کی تاریخوں میں افغانانِ ملتان کا بالعموم ایک علٰحدہ باب باندھا جاتا ہے، اگرچہ ملتانی افغان مدت سے اپنی آبائی خصوصیات کھو کر محض ہندوستانی ہو کر رہ گئے ہیں،

تاریخی حالات میں بعض کی صحت کے متعلق کلام ہے، یہ کوئی خاص اہمیت نہ بھی رکھتے ہوں، لیکن آپ ایسے محقق کے قلم سے نکلے ہیں، لہذا شک رفع کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا، علاوہ ازیں یہ بھی خیال ہے کہ آپ کا سفرنامہ غالباً علٰحدہ کتاب کی صورت میں بھی شائع ہوگا اسلئے ضروری ہے کہ جو واقعات نادرست ثابت ہوں اس کتاب میں ان کی تصحیح کی جا سکے، اسی غرض سے حسب ذیل باتوں کی طرف توجہ دلانے کی اجازت چاہتا ہوں،

فقر و امارت کا پیوند آپنے ایک جگہ تحریر فرمایا ہے کہ "ایسے درویش یہاں بہت ہیں جو کہ بزرگوں کی گدیوں کے بوریا نشین ہیں، مگر اون کی زندگی امیرانہ ہے"، اور یہ رنگ غالباً حضرت شیخ الاسلام زکریا سہروردی کے بعد ہی سے شروع ہو گیا تھا، اس کے متعلق اتنا عرض ہے کہ یہ رنگ حضرت زکریا کے بعد سے نہیں بلکہ اُن ہی کے وقت سے شروع تھا، تمام تذکرے متفق ہیں، کہ آپ کو دولتِ باطن کے ساتھ دولتِ ظاہر کا بھی حصہ وافر عطا ہوا تھا، آپکی ظاہری زندگی نہایت امیرانہ تھی، اور آپ، ع

بزرگاں کہ نقد صفا داشتند　　چنیں خرقہ زیرِ قبا داشتند

کی زندہ تصویر تھے، برخلاف اس کے آپ کے فرزند اور جانشین شیخ صدر الدین عارف نہایت فقر منش انسان تھے، روایت یوں ہے کہ جب آپ کو بے شمار دولت ورثہ میں ملی، تو آپنے سب لٹا دی، سبب پوچھا گیا تو بولے کہ والد صاحب قبلہ نے نفس پر پوری طرح قابو پا لیا تھا، اس لئے انھیں دولت سے کسی قسم کے روحانی نقصان کا اندیشہ نہیں رہا تھا، مگر میں اپنے آپ میں اسقدر طاقت نہیں پاتا، ڈرتا ہوں کہیں لغزش نہ ہو، اسی لئے آزاد رہنا چاہتا ہوں، انکے بعد شیخ رکن الدین عرف شاہ رکن عالم پھر فقیری و امیری کے جامع ہوئے،

تین سلاطین کی جائے پیدائش، اس روایت پر کہ ملتان کو تین بڑے بادشاہوں کے مولد ہونے کا فخر حاصل ہے، آپنے یہ لکھکر قلم پھیر دیا ہے، کہ یہ "واقعات شاید تاریخ کے رو سے درست نہ ہوں" گذارش یہ ہے کہ کم از کم احمد شاہ ابدالی کی ولادت ملتان میں ہونے کی بابت کتبِ تواریخ میں کوئی اختلاف نہیں، احمد شاہ کا خاندان مدت سے ملتان میں نقل مکان کر آیا تھا، زمان خان ابدالی یہیں مقیم تھا، جب اوس کے گھر احمد خاں پیدا ہوا، یہی احمد خان بعد میں احمد شاہ ابدالی یا درانی کہلایا، اور اپنے زمانے میں ایشیا کا سب سے بڑا بادشاہ مانا گیا، اس کے خاندان کی ایک شاخ اب تک ملتان میں آباد ہے، احمد شاہ کی جائے ولادت پر محکمۂ آثار قدیمہ کی طرف سے سنگ مرمر کا ایک بڑا کتبہ بھی نصب ہے، جو غالباً آپ کے ملاحظہ سے نہیں گذرا،

محمد تغلق اور بہلول لودھی کے ملتان میں پیدا ہونے کی نسبت کسی اور تاریخ میں تو کچھ میری نظر سے نہیں گذرا، لیکن سر ایڈورڈ میکلیگن سابق گورنر پنجاب جنھوں نے ملتان کی تاریخ اور ملتانی زبان کی تحقیق میں کافی وقت صرف کیا، اس روایت کے ذمہ دار ہیں، بہلول لودھی کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ "حسین آگاہی" میں "خزانوالہ مکان" میں پیدا ہوئے، چھت کے گر پڑنے سے انکی والدہ شہید ہو گئیں، اور وہ عالم شہود میں آپہنچے،

محمد تغلق کے بارے میں بھی انہی کی روایت ہے، کہ ان کی ولادت کوٹلہ تولہ خاں میں ہوئی، یہ کوٹلہ تولہ خان دراصل کوٹلہ تغلق خان کی بگڑی ہوئی صورت ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ تغلق خاندان یہاں آباد رہا، علاوہ ازیں شاہ رکن عالم کا مقبرہ فیروز شاہ تغلق نے اپنے لئے تیار کرایا تھا، جو اسکی وفات کے بعد اسکے بیٹے محمد تغلق نے شاہ رکن عالم کی نذر کر دیا، ملتان میں اپنا مقبرہ تیار کرانا بھی فیروز شاہ کا قیام ملتان ثابت کرتا ہے، ایسی صورت میں محمد تغلق کا وہیں پیدا ہونا کسی طرح بعید از قیاس نہیں، افسوس ہے کہ سر ایڈورڈ میکلیگن نے اپنے ذریعۂ معلومات کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے، تا وقتیکہ کوئی ثبوت ان روایات کے برخلاف بہم نہ پہنچے، کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی، کہ ان کو غلط سمجھکر مسترد کر دیا جائے،

سورج مندر، ملتان کے مشہور سورج مندر کے متعلق آپ کو بالکل غلط اطلاع دی گئی، کہ یہ اب تک باقی ہے، اور اس کا نام پرہلاد پوری ہے، پرہلاد پوری کا مندر جو موجود ہے، اس سورج مندر سے بالکل مختلف ہے، جس کا ذکر

عربی تاریخوں میں آیا ہے، وہ سورج مندر، آدت مندر یا "ملتان" بالکل برباد ہو چکا ہے، اور اب اس کا نشان تک باقی نہیں، ہاں جیسا کہ آپ نے تحریر فرمایا ہے، محمد بن قاسم نے تو اسے بالکل نہ چھیڑا، البتہ اس کے قریب ایک جامع مسجد بنوا دی، مگر قرامطہ نے محمد بن قاسم کی جامع مسجد بند کر کے اس مندر کو توڑ کر جامع مسجد کر دیا، بعد ازیں سلطان محمود غزنوی نے مندر والی مسجد کو ویران کر کے پھر پہلی جامع مسجد کھول دی، اس کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ مندر دوبارہ آباد کر دیا گیا، کیونکہ انگریز سیاح تھیونات جب ۱۶۶۶ء میں یہاں سے گذرا تو اُس نے یہ مندر دیکھا اس کے تھوڑا عرصہ بعد شہنشاہ اورنگ زیب نے مندر کو بالکل بند کر دیا، اور مسجد پھر نئے سرے سے تعمیر کر دی، جس کے بلند مینار دور دور سے نظر آتے تھے، ۱۸۱۸ء میں جب ملتان سکھوں کے قبضہ میں آگیا، تو مسجد کو بارودخانہ میں تبدیل کر دیا گیا، آخر جب ۱۸۴۸ء میں انگریزوں نے حملہ کیا، تو ایک گولے کے پھٹنے سے اس بارودخانہ میں آگ لگ گئی، پانسو من بارود یکدم جل اٹھا، اور مسجد کی تمام عمارت اُڑ گئی، اسوقت سے نہ مندر باقی رہا نہ مسجد

بت کی ساخت کے متعلق آپ نے بیرونی کا قول نقل فرمایا ہے، کہ "یہ لکڑی کا بنا ہوا تھا، اور اوس کی دونوں آنکھوں میں دو سُرخ یاقوت جڑے ہوئے تھے"، مورخین کا اندازہ یہ ہے کہ جب بیرونی نے اس بُت کو آکر دیکھا تو یہ غالباً ایک جون بدل چکا تھا، ۶۴۱ء میں چینی سیاح ہیون سانگ یہاں سے گذرا، اس کے سفرنامہ کے مطابق یہ بُت سونے کا تھا، اور اسمیں جواہرات جڑے ہوئے تھے، بعد ازان کتاب چچنامہ میں جو ۱۲۱۶ء سے قبل لکھی گئی یہی بیان ہے کہ محمد بن قاسم کے حملے کے وقت (۷۱۲ء) میں یہاں ایک بت تھا، جو زر سُرخ کا بنا ہوا تھا، اصطخری (۹۵۱ء) نے لکھا ہے کہ یہ بت سُرخ مراکو چمڑے میں ملبوس تھا، مسعودی (۹۵۶ء) اور ابن حوقل (۹۷۶ء) نے بھی اسی طرح ذکر کیا ہے، ان کے بعد بیرونی نے یوں تصریح کی ہے، کہ بت لکڑی کا تھا مگر سُرخ قرطبی چمڑے سے منڈھا ہوا تھا، ادریسی (۱۱۰۳ء) نے بت کا ذکر کیا ہے، مگر یہ نہیں لکھا کہ کس چیز کا بنا ہوا تھا، پھر قزوینی (۱۲۷۵ء) نے بھی اس کی ماہیت بیان نہیں کی، سب سے آخر میں انگریز سیاح تھیونات (۱۶۶۶ء) نے جو حال لکھا ہے، اسکے رو سے بُت پر سُرخ چمڑا چڑھا ہوا

تھا، چہرے کا رنگ سیاہ تھا، اور آنکھوں کی جگہ دو موتی جڑے ہوئے تھے، ان سب بیانات کے پیش نظر وضح یوں معلوم ہوتا ہے، کہ ابتدا میں یہ بت خالص سونے کا تھا، جسے قرامطہ نے توڑ دیا، بعد میں دوبارہ جو بت بنایا گیا، وہ لکڑی کا تھا، سورج مندر اور جامع مسجد کے محل وقوع کے متعلق سب سے آخری شہادت جنرل کنگھم کی ملتی ہے، جس نے ۱۸۵۳ء میں قلعہ کے عین وسط میں ان کے ٹوٹے پھوٹے نشانات دیکھے، محکمۂ آثار قدیمہ نے جب ۱۹۲۲ء میں اس مندر کے بارے میں تحقیقات کی تو یہی اندازہ کیا کہ یہ شاہ رکن عالم کے مزار کے ذرا مشرق کی طرف اس مقام پر واقع تھا، جہاں اب پرانی بارکیں کھڑی ہیں، بہرصورت یہ یقینی ہے کہ نہ تو پرہلادپوری وہ سورج مندر ہے، اور نہ حضرت بہاء الدین زکریا کا مزار وہ مقام جسے مسجد بنایا گیا،

کوزہ میں دریا، یہی چند باتیں تھیں، جو مجھے نادرست معلوم ہوئیں، اُن سے قطع نظر باقی آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے، گویا دریا کو کوزے میں بند کیا ہے، بارہ صفحوں میں ملتان کی تاریخ کا نہ صرف عطر نکال کر رکھدیا ہے، بلکہ بعض ایسی معلومات بھی فراہم کر دی ہیں، جو ملتان کی بڑی سے بڑی تاریخون میں بھی نہیں مل سکتیں،

رح ملتان کے چند اشعار، ملتان کی شاندار اسلامی تاریخ، لوگوں کی معاشرت اور علاقہ کی طبعی حالت کے مطالعہ سے متاثر ہو کر پچھلے سال چند اشعار موزوں کئے تھے، وہ یہان نقل کئے دیتا ہوں، شاید آپ کو پسند آئیں،

مُلتان

خطۂ پاکیزۂ ملتان و سند	ہست تصویر عرب در ملک ہند،
سوئے ریگستان و نخلستان نگر	جلوۂ خاک حجاز آید نظر،
می کند اعلان ہر نخل بلند	این زمین از فیض یثرب بہرہ مند،
از خرام اُشتران آیم بہ وجد	یاد می آید مرا صحرائے نجد،
سندیان را طرز ملبوس دراز	یادگار ہست از اہل حجاز،
نیز در ملتانیان حق پرست	رنج اوصاف حجازی مضمر است

اہلِ ملتاں از تکلف بے نیاز — سادہ دل شیریں زباں مہماں نواز

مایۂ ناز است بہر ایں زمیں — نقش پائے ابنِ قاسم بر جبیں

در ضلالت خانۂ ہندوستان — اوّلیں آبادیِ اسلامیاں

ماندہ است ایں سرزمینِ اولیا — قبلۂ مقصودِ اربابِ صفا

گر کنوں تشکیلِ پاکستاں شود — مرکزِ آں مملکت ملتاں شود

ایں مقدس خاک را اے کردگار

از ہوائے مغربی محفوظ دار

آخر میں معذرت چاہتا ہوں، کہ انتہائی کوشش اختصار کے باوجود خط کافی لمبا ہو گیا ہے، آپ کے قیمتی وقت کا پورا احساس ہے، مگر میری دلچسپی کا مضمون تھا اسلئے اسقدر لکھ ڈالا، اگر مناسب سمجھیں تو یہ خط معارف میں شائع فرما دیں، تاکہ جنھوں نے اپکا سفر نامہ پڑھا ہے وہ یہ حالات بھی دیکھ لیں،

معارف :- زیر بحث وزن عروضی کی نسبت آپ کو جو شبہ پیدا ہوا ہے، اوس کی بنیاد یہ ہے کہ ایک مصرع میں مفعولُ فاعلاتُ مفاعیلُ فاعلُن ہے، اور چوتھے میں مفعول فاعلاتن مفاعیلُ فاعلن ہے اور آپ اوس کو خلافِ اصول جانتے ہیں، مگر یہ صحیح نہیں، بحر مضارع کا اصلی فارسی وزن مفاعیلن فاعلاتن مفاعیلن فاعلاتن ہے مگر اس کے سارے ارکان ملفوف ہو کر آتے ہیں، یعنی مفاعیل فاعلات پھر مفاعیل اخرب ہو کر مفعول ہو جاتا ہے، مگر کسی رکن کا سالم ہونا بھی جائز ہے، اس طرح ایک مصرع میں مفعول فاعلاتُ اور دوسرے میں فاعلاتن تو نادرست نہیں، مثال ملاحظہ ہو،

اے عید دین و دولت عیدت خجستہ باد — ایامت از حوادثِ ایام رُستہ باد

دوسرا رکن پہلے مصرع میں فاعلاتن ہے، اور دوسرے میں فاعلاتُ ہے،

معاییر اشعار العجم ابن قیس رازی ص ۱۱۹،

۲- ان تین بادشاہوں میں سے محمد تغلق اور بہلول لودھی کی ملتان میں پیدائش کے متعلق خود آپ کو تسلیم ہے کہ تاریخی اسناد معدوم ہیں، البتہ احمد شاہ درانی کی پیدائش ملتان کی نسبت تصریح ملتی ہے مگر یہ بیان بھی متفقہ نہیں، تاریخ احمد میں ہے:-

"در ابتدا، بزرگان احمد شاہ از ملتان کہ قدیم ماواؤ منشائے شان بود، بہرات رفتہ سردار و رئیس قوم گردیدند، و تردد بعضے تولد احمد شاہ نیز در ملتان شدہ بود و در صغر سن ہمراہ والد بزرگوار خود محمد زمان بہرات وقندھار رفت" (ص ۵)

عربی کا ایک قدیم مطبوعہ

از

جناب محمد عبد الوہاب صاحب مسلم، حیدرآباد دکن

دسمبر کے معارف میں امتیاز علی صاحب کا استفسار متعلق قانون شیخ الرئیس اور اس پر آپ کا نوٹ نظ
ے گذرا، دو سال قبل ایک مرتبہ میں پروفیسر آغا حیدر صاحب کا کتبخانہ دیکھ رہا تھا، اثنائے گفتگو میں انھوں
نے ایک قدیم مطبوعہ کتاب کا ذکر کیا، جسے میں اسوقت نہ دیکھ سکا، آپ کی تحریر سے اُسکا خیال آیا تو میں پ
انکے پاس گیا، وہ کتاب نکالی، اور اب یہ نوٹ حاضر خدمت ہے:-

اس کتاب کا نام کتاب عجائب القدور فی اخبار تیمور ہے، اور مؤلف کا نام "احمد بن عربشاہ"،

لوح میں مندرجۂ ذیل عبارت درج ہے،

"کتاب عجائب القدور فی اخبار تیمور، تالیف احمد بن عربشاہ"،

Ahmed is Arabsiadeae

A Vilae S. rerum geflarum.

Timuri

Qui Vulgo

TamerLanes

Diciltur

Historia

LogduniBatavorym

Ex Typograpohia

Else Viririana

C L J C XXXVI

اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہ کتاب ۱۶۳۶ء میں شائع ہوئی،

ابتدا میں Jacobus Cjalius Studiofis لکھا ہے،

Qui in Linguae Audio cum" اسکے بعد دیباچہ

Laude" سے شروع ہوتا ہے،

اس دیباچہ کے ختم پر اصل کتاب "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وھو حسبی ونعم الوکیل" کے بعد الحمد للہ
الذی علی منوال ارادتہ وتدبیرہ تنسج مقاطع الامور ومن ینبوع قضایہ الی لجج قدرہ تجری....."
سے شروع ہوکر..... افعالنا واحوالنا وحسبنا اللہ ونعم الوکیل" پر ختم ہوتی ہے،

معارف:- ابن عربشاہ اور اوس کی تصنیف عجائب المقدور فی اخبار تیمور بہت مشہور کتاب ہے،
ہندوستان اور مصر میں کئی بار چھپ چکی ہے، قانون شیخ کے نسخہ کا سال طبع ۱۵۹۳ء اور عجائب المقدور کا ۱۶۳۶ء
ہے یعنی قانون شیخ سے چوالیس برس پہلے، آپ کی یہ اطلاع مفید ہے،

افکار عصریہ

سائنس نے جنگ عظیم کے بعد جو ترقیاں کی ہیں، یہ کتاب ان تمام ترقیوں کا خلاصہ ہے، کتاب ۲۲ بابوں میں
تمام ہوئی ہے، اور ہر باب میں سائنس کے مختلف اہم مسائل کی تحقیق کیگئی ہے، ضخامت ۲۰۰ صفحے، قیمت عمر "منیجر"

تلخیص و تبصرہ

ڈارون کے نظریۂ ارتقاء پر اکابر سائنس کا تصادم

چند روز ہوئے انگلستان کے ممتاز سائنسداں سر ایمبروز فلیمنگ (Ambrose Fleming) نے "وکٹوریا انسٹی ٹیوٹ اینڈ فلاسوفیکل سوسائٹی آف گریٹ برٹین" کے اجلاس میں جو لندن میں منعقد ہوا تھا ایک ایسا خطبۂ صدارت پیش کیا، جو ڈارون کے نظریۂ ارتقاء پر غیر متوقع اور شدید حملوں سے پر تھا، اور جس نے برطانیہ کے علمائے سائنس میں ایک ہیجان برپا کر دیا ہے، چنانچہ وہاں کے ممتاز ماہرین انسانیات نے سر ایمبروز کے خطبہ کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار پریس کے مختلف نمایندوں سے بھی کر دیا ہے، ہم اس خطبہ کا خلاصہ اور ناقدین کے تنقیدوں کے اقتباسات ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

سر ایمبروز نے اُن شہادتوں کے تجزیہ و تشریح کے بعد جو "انسان" کے مفروضہ آبا و اجداد کی لاشوں سے متعلق حال کے اکتشافات سے حاصل ہوئی ہیں، فرمایا کہ ہم اب بھی اس امر کا کوئی سنجیدہ ثبوت نہیں رکھتے کہ انسان اپنی اصل میں پہلے جانور تھا، اور منازلِ ارتقاء کو طے کرتا ہوا موجودہ حالت تک پہنچا ہے، اسی طرح ہم اس بات کی خفیف سے خفیف واقفیت بھی نہیں رکھتے کہ خالی فضا (EMPTY SPACE) اول اول کیونکر مادہ کی حد درجہ ابتدائی شکلوں سے پر ہو گئی، اور نہ ہم یہ جانتے کہ حیات کی ابتدا کیونکر ہوئی، ہم کسی طرح اسکے وجود کو ایک سابق زندگی سے علحدہ کر کے نہیں دکھا سکتے، لہذا یہ دو ایسے زبردست خلا ہیں جنھیں ارتقاء کا کوئی نظریہ ابتک پر نہیں کر سکا ہے، وہ علماء حیاتیات جو کائنات میں مادہ کی کارفرمائی

کے قائل ہیں، دماغ (Brain) کے فعل کے علاوہ "نفس" (Mind) یا "روح" (Spirit) کے مستقل وجود کو تسلیم نہیں کرتے لیکن اس بات کی بہتیری قوی دلیلیں موجود ہیں، کہ "نفس" "دماغ" سے بڑھکر کوئی علحدہ شے ہے، اگرچہ یہ ممکن ہے، کہ "دماغ" "نفس" ہی کا ایک آلہ ہو،

ماہرین ارتقاء ہنوز اس مسئلہ کے حل سے قاصر ہیں، کہ اگر انسانوں اور بندروں کا مورث ایک ہی ہے تو پھر اس کا کیا سبب ہے، کہ انسانوں کی حیرت انگیز قوتیں تو روز بروز ترقی کرتی جا رہی ہیں، لیکن بندروں میں یہ قوتیں بالکل معدوم ہیں،

سر ایمبروز کا عقیدہ ہے کہ انسان کی اصل و ابتداء خالق یکتا کی صفتِ خلق کی رہین منت ہے، موصوف فرماتے ہیں، کہ ارتقاء جیسی مجرد اصطلاح جو محض تدریجی ترقی و تغیر کے معنی رکھتی ہے، انسان کی عقل و پیدائش کا مسئلہ حل نہیں کر سکتی، اور نہ یہ کہدینے سے کہ انسان کی ابتدا جانور کی شکل سے ہوئی ہے، کچھ بھی دشواری دور ہو سکتی ہے، قدیم زمانہ کی بوسیدہ ہڈیاں جو کھود کر نکالی گئی ہیں، اس امر کا کافی ثبوت بہم نہیں پہنچاتیں، کہ پہلے انسانوں اور بندروں کے مشترک مورثوں کی ایک ایسی نسل بھی روئے زمین پر آباد تھی، جس سے منازلِ ارتقاء کے طے ہونے کا نشان ملتا تھا، لہذا بشپ بارنس (Bishop Barnes) کا یہ بیان کہ "آج ماہرین سائنس اس امر پر تمام تر متفق ہیں کہ انسان کا ارتقاء کسی ایسی اصل سے ہوا ہے، جو بندر سے مشابہ ہے،" بالکل بے بنیاد ہے،

سر ایمبروز نے فرمایا کہ انسان جب خود اپنے وجود اور قوتِ فہم کا شعور رکھتا ہے، اور جانتا ہے، کہ وہ خود بھی بعض چیزوں کو پیدا کر سکتا ہے، تو پھر یہ تخیل اسے کیوں "ناقابلِ یقین" معلوم ہوتا ہے، کہ خالقِ مطلق کی قدرت جسکی کارفرمائی کے مظاہر ہمیں غیر نامیاتی عالم (Inorganic world) میں دکھائی دیتے ہیں، نہ صرف ذروی مادہ (Atomic Matter) اور توانائی (Energy) کو پیدا کر سکتی ہے، بلکہ نامیاتی اجسام (Organic forms) میں زندہ مادہ کو بھی پیدا کر سکتی ہے؟ اسی بنا پر ہم حضرت مسیحؑ سے متعلق مندرجۂ ذیل بیانات کو محض افسانہ اور خرافات قرار دیکر مسترد نہیں کر سکتے

آپ نے ایک جھیل میں جسمیں تھوڑی ہی دیر پیشتر ایک مچھلی بھی نہیں تھی، فوراً ہی بہت سی مچھلیاں پیدا کردیں، آپ بڑے بڑے مجمعوں کو کھلانے کیلئے چشم زدن میں روٹی اور مچھلی پیدا کردیتے تھے، آپنے ایک لفظ کہکر پانی سے شراب بنادی اور مردوں کو زندہ کردیا"

خصوصاً جب اس امر کی نہایت قوی شہادت موجود ہے، کہ حضرت مسیحؑ خود صلیب پر جسمانی موت برداشت کرنے کے تین روز بعد پھر اپنی پیشین گوئی کے مطابق جی اٹھے، ہمیں ان بیانات کو غلط قرار دینے کا حق اسوقت تک حاصل نہیں ہے، جب تک ہم نہایت احتیاط کیساتھ انکی شہادتوں کی تحقیق نہ کرلیں، اور تحقیق کے بعد انہیں قطعی طور پر ناقابلِ اعتماد نہ پالیں، جنلوگوں نے اسطرح تحقیق کی ہے، وہ متفق ہیں کہ حضرت مسیحؑ کا دوبارہ جی اٹھنا تاریخ انسانی کا ایک نہایت متیقن اور تصدیق شدہ واقعہ ہے،

بائبل میں جو بیان انسان کی اصل وابتدار کی نسبت دیا ہوا ہے، ممکن ہو دشواریوں سے بالکل صاف نہ ہو لیکن وہ امر واقعہ سے بہت زیادہ قریب ہے، بہ نسبت اس تعلیم شدہ مفروضہ کے کہ انسان کی ابتدار جانور سے ہوئی ہے، اور وہ خود بخود بتدریج ترقی کرتا ہوا، موجودہ حالت تک پہنچا ہے، اگر نظریۂ ارتقار کے تسلیم کرنے والے آبادی کی ترقی کا کم سے کم اوسط بھی مان لیں، یعنی تین سو برس میں دوچند ہوجانا، تو اس حساب سے نو ہزار برس میں انسانوں کا ایک جوڑا ایک ارب جوڑا ہوجائے گا، لہٰذا اگر زمانہ قبل تاریخ کے انسان کی افزائش نسل کا اوسط تقریباً اتنا ہی تھا، اور وہ اس زمین پر دس ہزار برس سے آباد ہے، تو اسوقت اسکی تعداد اتنی کثیر ہوجانی چاہیے تھی، کہ تقریباً تمام معلوم دنیا اس سے بھر جاتی، لیکن سوال یہ ہے کہ اتنی کثیر آبادی کے آثار کہاں ہیں؟ اب تک جو کچھ دستیاب ہوسکا ہے، وہ صرف چند درجن کاسہ سر اور بوسیدہ ہڈیاں ہیں، اور وہ بھی دور دراز مقامات میں بہت متفرق طور پر تنہا یہی امر اس بات کے لئے کافی ہے، کہ ان چند انسانی یا نیم انسانی ہڈیوں کے لئے بڑی بڑی عمروں کا جو نظریہ قائم کرلیا گیا ہے، وہ مسترد کردیا جائے، یہ تمام واقعات بائبل کے بیان سے نسبتہً بہت زیادہ مطابق ہیں، نیز اس خیال کی بہت کچھ تصدیق کرتے ہیں، کہ نوع انسانی کی آفرینش عہد تاریخ

کے بعد عمل میں آئی،

سر ایمبروز کا دعویٰ ہے، کہ ڈارون کا نظریۂ ارتقار محض تخیل کی بنیاد پر قائم ہے، نہ کہ ایسی شہادتوں پر جو ناقابلِ انکار ہوں، موصوف نے اپنے خطبہ کے خاتمہ پر بتایا کہ نظریۂ ارتقار کا عقیدہ مسیحیت کے بنیادی اصول اور انجیل کی تعلیم کے بالکل مخالف ہے، آخر میں فرمایا:-

"یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ مذہبی پیشوا علم انسانیات کے جس کا مدار مادیات پر ہے، غیر مصدقہ قیاسات کو تصدیق شدہ ثبوت کی طرح تسلیم کرلیتے ہیں، معجزہ یا خدا کے کسی ایسے فعل سے انکار کردیتے ہیں، جو معمول کے خلاف عمل میں آیا ہو، اور یہ فرض کرلیتے ہیں، کہ جو واقعات ہمارے موجودہ تجربۂ فطرت سے مختلف اور اس کے دائرہ سے باہر ہیں، وہ نہ ابتک پیش آئے ہیں، اور نہ آیندہ کبھی پیش آسکتے ہیں، ایسا کرنے میں وہ ایک غیر مستقل اور ہمیشہ تبدیل ہونے والی سائنس کی کمزور بنیادوں پر اپنے نظریہ کی تعمیر کررہے ہیں، بجائے اسکے کہ کتب مقدسہ پر اعتماد کریں، جن کے بیانات کی تصدیق روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے، اور جو خطا کار انسانوں کے قیاسات سے نہیں، بلکہ خدا کے مقدس بندوں کے ارشادات سے پر ہیں، جو روح القدس کی ہدایت کے مطابق کلام کرتے تھے"

سر ایمبروز کے خطبہ سے جس کا خلاصہ سطور بالا میں پیش کیا گیا ہے، سائنس دانوں کی جماعت میں ایک عام برہمی پیدا ہوگئی ہے، اور برطانیہ کے تین ممتاز ماہرین انسانیات سر آرتھر کائتھ (arthur Keith) سر گریفٹن اسمتھ (Grafton Smith) اور پروفیسر کلارک (Clark) نے سر ایمبروز کی رائے کی پرزور مخالفت کی ہے، چنانچہ سر آرتھر کائتھ نے ڈارون کے نظریہ کی حمایت کرتے ہوئے فرمایا، ساٹھ سال سے زاید مدت گذری ڈارون نے انسان کی اصل (Descent of man) میں ارتقار کا جو ثبوت پیش کیا تھا، وہ اسقدر قطعی ہے کہ اسوقت سے ابتک کوئی ماہر حیاتیات اُسے رد نہیں کرسکا، اسکے بعد جتنے اکتشافات ہوئے، سبنے اوسکی تصدیق کی، اور ان میں سے ہر اکتشاف نے انسان کی

قدامت کو اور زیادہ وسعت دی...... اسمیں شبہ نہیں کہ نسلِ انسانی کی عمر پانچ لاکھ بلکہ غالباً دس لاکھ برس ہے، انسان کی
نشو و نما دفعۃً عمل میں نہیں آگیا، مجھے اندیشہ ہے کہ سر ایمبروز فلیمنگ اس بات کو بھول رہے ہیں کہ سنگی آلات میں انسان کی
کا ثبوت ملتا ہے، یہ آلات دنیا کے ہر حصہ میں برآمد ہو رہے ہیں، اور اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ نسلِ انسانی کی عمر لاکھوں برس کی ہے
...... قدیم انسان کے جتنے اکتشافات ہوئے ہیں، انمیں سے ایک نہایت عجیب و غریب اکتشاف کی تحقیق آجکل کی جا رہی ہے
یہ نمونے فلسطین میں کوہ کارمل کے دروں میں پائے گئے تھے، امید ہے کہ ہم جلد بتا سکیں گے، کہ یہ لوگ کہاں رہتے تھے، ان
کا طرزِ معاشرت کیا تھا، اسمیں شبہ نہیں کہ یہ لاشیں ایک لاکھ برس کی ہیں،"

ایک نامہ نگار نے سر آرتھر کائتھ سے سر ایمبروز کے اس اعتراض کا ذکر کیا، کہ اسکی کیا وجہ ہے کہ انسان میں تو حیرت انگیز
قوتیں اور استعدادیں موجود ہیں، لیکن اسکے اصل جانور بندر میں یہ چیزیں بالکل مفقود ہیں، سر کائتھ نے جواب دیا، سر ایمبروز
اسکا جواب دے سکتے ہیں اور نہ میں، مجھے اسکا سبب معلوم نہیں لیکن اسکی کیا وجہ ہے کہ ایک خاندان میں تو سر آئزک نیوٹن (Isaac Newton)
پیدا ہوتا ہے، اور دوسرے خاندان میں ایک مادر زاد احمق؟ سر ایمبروز اس مسئلہ پر کیا روشنی ڈال سکتے ہیں؟"
پر جو اعتراض سر ایمبروز نے کیا تھا، اسکے متعلق فرمایا، "اس مسئلہ پر تمام سائنسدان کبھی کلی طور پر متفق نہیں ہوئے، ماہرین سائنس
اسکی نسبت مختلف رائیں رکھتے ہیں، لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ کسی سائنٹفک مسئلہ پر کبھی اتنا اتفاقِ آرا نہیں ہوا ہے، جتنا ماہرین
حیاتیات کے درمیان ارتقاء کے مسئلہ پر ہے، علمائے حیاتیات دو باتوں میں بالکل متفق ہیں (۱) انسان کی قدامت جسے دس لاکھ
برس قرار دیتے ہیں، اور (۲) انسان کا ارتقاء، غالباً سر ایمبروز کے نزدیک بہتر ہوگا، اگر میں ارتقاء کے بجائے پیدائش
کا لفظ استعمال کروں، لیکن اگر میں اس لفظ کو استعمال بھی کروں، تو یہ اس معنی میں نہ ہوگا، جس معنی میں کتاب پیدائش
میں استعمال کیا گیا ہے، بلکہ اُس فطری اور قدرتی پیدائش کے معنی میں ہوگا، جو ہماری اس دنیا میں برابر جاری ہے"

حضرت مسیح کے دوبارہ زندہ جی اٹھنے اور معجزات کے وقوع سے انکار کرتے ہوئے سر آرتھر کائتھ نے کہا،
سر ایمبروز فلیمنگ خاص طور پر خوش قسمت ہیں، کہ وہ ان معجزات پر عقیدہ رکھتے ہیں، میرے نزدیک اُن کے اس عقیدہ
کا سبب یہ ہے، کہ وہ علمِ حیاتیات سے ناواقف ہیں، میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ کسی ایک شخص کے متعلق بھی یہ

شہادت موجود نہیں ہے، کہ وہ مرجانے کے بعد پھر جی اٹھا، اگر کوئی ایسا شخص دوبارہ زندہ ہو گیا، تو وہ مرا ہی نہ تھا"

سر گرافٹن اسمتھ نے بھی جو لندن یونیورسٹی میں تشریح الاعضاء کے پروفیسر ہیں، اور ایک ممتاز ماہر انسانیات
کی حیثیت سے دنیا کے مختلف حصوں میں قدیم انسانوں کی کھوپڑیوں اور بوسیدہ ہڈیوں کی تحقیق کر چکے ہیں،
سر ایمبروز کے خطبہ کی شدید مخالفت کی، اور موصوف کے اس خیال کو کہ نظریۂ ارتقاء محض تخیل کی پیداوار ہے،
معلوماتِ جدیدہ سے کامل عدمِ واقفیت پر محمول کیا، پھر اس اعتراض کے جواب میں کہ اگر انسانوں اور بندروں
کا مورث ایک ہی تھا، تو کیا وجہ ہے کہ جو حیرت انگیز قوتیں اور استعدادیں انسانوں میں روز افزوں ترقی کر رہی
ہیں وہ بندروں میں بالکل غائب ہیں، فرمایا "اس سوال کا جواب جسے سر ایمبروز نے ایسے یقین کے ساتھ پیش
کیا ہے، حال میں متعدد سائنس دانوں نے مفصل طور پر دیا ہے، خصوصاً ڈاکٹر زکرمین (Dr. S. Zuckerman) نے اپنی کتاب "انسان اور بندروں کی ملتی جلتی قوتیں" (Functional Appinlies of man Monkeys & Apes) اور ڈاکٹر کلارک (W. E. le Gras Clark) نے اپنی تصنیف "انسان کے قدیم پیشرو" (Early Forerunnirs of man) میں، یہ دونوں صاحبان اسوقت آکسفورڈ میں اس مسئلہ
کی تحقیق کر رہے ہیں...... اس موضوع پر بہت شاندار کام ڈاکٹر کوہلر (Koehler) نے بھی اپنی کتاب "بندر، شمپانزی اور گوریلا کی ذہنیت" (Mentality of Apes Chimpanzees and Gorillas)
میں کیا ہے، انھوں نے دکھایا ہے، کہ ان تینوں قسم کے بندروں میں مسائل کو سمجھنے اور انکو حل کرنے کی استعداد پائی
جاتی ہے، ان تحقیقات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے، کہ بندروں میں وہ قوتیں موجود ہیں، جنکے وجود سے سر ایمبروز انکار
کرتے ہیں، اگر انھیں مناسب حالات میسر ہوں تو بندر بھی اپنی دماغی استعداد کو ترقی دے سکتے ہیں،" آخر میں سر گرافٹن
نے فرمایا کہ حال کے اکتشافات اور تحقیقات کی کثرت سے نظریۂ ارتقاء کی صحت درجۂ یقین تک پہنچ چکی ہے، اور اسکی مخالفت
ایک ایسے سائنس دان کی زبان سے جو حالاتِ موجودہ سے قطعاً ناواقف ہے، بلاشبہ تعجب خیز ہے، (ص - ۱)
"ع ز"

سنہ ۱۹۳۴ء میں سائنس کے کارنامے

سنہ ۱۹۳۴ء میں سائنس کے ہر شعبہ نے نمایاں ترقی کی ہے، لیکن انجینیرنگ، وسائلِ نقل و حمل، طب، نجوم، کیمیا، طبیعیات، ہیئت، جویات، اور اثریات میں اس کے کارنامے خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں، ہوا، پانی، اور زمین کے وسائلِ سفر میں انجینیروں نے سائنس کی مدد سے حیرت انگیز ترقی دکھائی ہے، امریکہ میں ڈِورَیلوے ٹرینیں جاری کی گئی ہیں، جنکی رفتار سو میل فی گھنٹہ ہے، اسی رفتار کی اور گاڑیاں بھی تیار کی جارہی ہیں، برطانیہ نے کوئن میری نامی ایک عظیم الشان جہاز تعمیر کیا ہے، جس کا طول ایک ہزار اٹھارہ فٹ ہے، اور جس میں تحفظ اور آرام و آسائش کی جدید ترین اصلاحات کا پورا اہتمام کیا گیا ہے، سرعتِ رفتار کے لحاظ سے بھی اسے خاص خصوصیت حاصل ہے، امید ہے کہ امسال پہلی بار یہ مسافروں کو لیکر اپنے بندرگاہ سے روانہ ہوگا، اس کے مقابلہ میں اہلِ فرانس "نورمنڈی" نامی ایک جہاز تیار کر رہے ہیں، جو اپنی رفتار اور دوسری اصلاحات میں "کوئن میری" کا حریف ہے، اور طول میں اس سے گیارہ فٹ زیادہ ہے، یہ جہاز ۹ مئی سنہ ۳۵ء کو پہلی مرتبہ فرانس سے نیویارک کو روانہ ہوگا، طیاروں کی ترقی بھی کچھ کم شاندار نہیں ہے، گذشتہ اکتوبر میں لندن سے ملبورن (آسٹریلیا) کی ہوائی دوڑ سرعتِ رفتار کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے، اسی سال دنیا کے تمام حصوں میں ہوائی ڈاک کے راستے قائم ہوگئے ہیں، اور اب آسٹریلیا سے ریاستہائے متحدہ امریکہ کے کسی بڑے شہر میں ہوائی جہاز کے ذریعہ ڈاک بھیجی جاسکتی ہے، امید کیجاتی ہے، کہ سنہ ۱۹۳۵ء کے اختتام تک دنیا کے کسی ایک شہر سے دوسرے شہر تک ہوائی جہاز پر سفر کرنا ممکن ہوجائیگا، سنہ ۱۹۳۴ء میں جنوبی اطلانٹک پر ہوائی سفر جاری ہوگیا تھا، خیال ہے کہ جلد شمالی اطلانٹک اور بحر الکاہل پر بھی طیاروں کے ذریعہ آمد و رفت کا سلسلہ قائم ہوجائیگا،

امریکہ کے تین ڈاکٹروں ڈاکٹر جارج وہپل (Dr. George Whipple)

ڈاکٹر جارج مائنٹ (Dr. George Minot) اور ڈاکٹر ولیم مرفی (Dr. William Murphy) کو طب کی مختلف شاخوں کی تحقیق کے صلہ میں نوبل انعام دیا گیا ہے، جو سب سے بڑا انعام سمجھا جاتا ہے، متعدد ڈاکٹروں نے تجربہ کیا ہے، کہ ایک شخص کے غدود دوسرے شخص کے جسم میں کامیابی کے ساتھ منتقل کئے جاسکتے ہیں، فلاڈلفیا کے ایک ڈاکٹر لیونرڈ روٹری (Leonard Rowntree) ہی نے غدود ہی سے متعلق ایک ایسے طریقہ کی تحقیق کی ہے، جسکے استعمال سے آیندہ نسلوں کی بالیدگی تیزی کے ساتھ ہوسکتی ہے، برطانیہ کے ماہر کیمیا، ڈاکٹر کوک (Dr. J. W. Cook) نے سرطان کا ایک سبب دریافت کرلیا ہے، بچوں کے رعشہ اور لقوہ کی بھی دو مجرب دوائیں معلوم کرلی گئی ہیں،

امریکہ میں آب پاشی، سیلاب کے سدباب، بند اور نہروں کی تعمیر، اور پانی سے بجلی کی طاقت حاصل کرنے کا کام سنہ ۱۹۳۴ء میں جس عظیم الشان پیمانہ پر شروع کیا گیا ہے، اسکی نظیر تاریخ کے کسی دور میں نہیں ملتی، اس سلسلہ میں جو تجویزیں پیشِ نظر ہیں، اون کی تکمیل کے مصارف کا تخمینہ چالیس کرور ڈالر کیا جاتا ہے، انجینیروں کی پیشین گوئی ہے، کہ ان تجویزون کے تکملہ کے بعد امریکہ میں ایک نئے "عہدِ قوت" (Powerage) کا افتتاح ہوجائے گا، اور بجلی اس قدر وافر اور ارزاں ہوجائے گی، کہ ہر خاندان اوسے کثرت سے استعمال کرسکے گا،

ماہرینِ برق و کیمیا نے آفتاب کی گرمی اور روشنی سے براہ راست بجلی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اور کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر کولن فنک (Colin G. Fink) اس تجربہ میں ایک حد تک کامیاب بھی ہوگئے ہیں، "جنرل الکٹرک کمپنی" کے انجینیروں نے ایک ایسا موٹر تیار کرلیا ہے، جو روشنی سے حاصل کی ہوئی بجلی کی طاقت سے چلتا ہے،

علم کیمیا کے تجربات متعدد اور بہت اہم ہیں، جنوبی امریکہ میں ڈاکٹر چارلس ہرٹی (Charles Herty) نے صنوبر کے درخت کے بہت سے نئے استعمال دریافت کئے ہیں، ہوائی یونیورسٹی کے ڈاکٹر جان پین (John Payne)

نے اعلان کیا ہے، کہ گنے کے پھوک سے سیلولوز (Cellulose) پیدا کیا جا سکتا ہے،
یہ تجربہ ایک نئی صنعت کا پیش خیمہ ہے، ۱۹۳۴ء ہی میں پہلی مرتبہ نمک، پانی، اور اسٹائلین (Acetylene)
کے مرکب سے ایک قسم کا مصنوعی ربر تیار کیا گیا ہے، محکمۂ زراعت، ریاستہائے متحدہ کے ماہرین کیمیا نے اعلان
کیا ہے، کہ دوسرے اقسام کے مصنوعی ربر بھی تیار کئے جا سکتے ہیں، ڈاکٹر فلائڈ میٹزگر (Floyd Metzger)
نے ہوا سے دو نادر گیسوں کرپٹن (Krypton) اور زنن (Xenon) کے نکالنے
کے طریقے معلوم کرئے ہیں، اگر برقی لیمپوں میں بھرنے کیلئے یہ گیسیں بجائے آرگن (Argon) کے
استعمال کیجائیں، تو ریاستہائے متحدہ امریکہ میں، روشنی کے سالانہ مصارف میں بیس کروڑ ڈالر کی تخفیف ہو جائیگی
یعنی پانچ لاکھ ڈالر روزانہ کی، سمندر کے پانی سے برومین (Bromine) نکالنے کا تجربہ بھی
کامیاب ہوا ہے، ۱۹۳۴ء میں علم کیمیا کا نوبل انعام کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر ہیرلڈ اورے (Harold Urey)
کو دیا گیا ہے،

۱۹۳۴ء ہیئت کا عہد زرین خیال کیا جاتا ہے، اس سال بہتیرے اہم سیارے دریافت ہوئے ہیں
متعدد بڑی بڑی دوربینیں تیار کی گئی ہیں، جنمیں سے ایک دوربین کے عاکس (Reflector) کا قطر دو سو
انچ ہے، اس ایک سال کے اندر سترہ سو نئے ستاروں کا مطالعہ کیا گیا ہے، اور ستارہ زیٹا آرگیے (Zeta Aurigae)
میں ایک ایسے گرہن کا مشاہدہ کیا گیا، جو تیس روز تک قائم تھا،

الٰہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر شاہ محمد سلیمان نے اضافیت کا ایک جدید نظریہ پیش کیا
ہے، جس کے نتائج آئنسٹائن کے نظریہ سے ملتے جلتے ہیں، لیکن اس میں مدد نیوٹن کے نظریہ سے
لی گئی ہے،

(ل۔ ڈ،) "ع ز"

———.———

اخبارِ علمیہ

آفتاب کی کرنوں کا نیا استعمال

رصد خانہ ماؤنٹ ولسن، کیلیفورنیا کے مشہور ہیئت دان ڈاکٹر چارلس ایبٹ (Dr. Charles Abbot)
نے حال میں ایک ایسا چولھا ایجاد کیا ہے، جو صرف آفتاب کی حرارت سے گرم رہتا ہے، اسکی شکل غسلخانہ کے گرماوے
سے مشابہ ہے، لیکن پانی کے بجائے اسمیں تیل بھر دیا جاتا ہے، اور تیل ہی سے یہ گرم ہوتا ہے، اسکے اوپر شیشے لگے ہوئے
ہیں جن پر آفتاب کا عکس پڑتا رہتا ہے، یہ شیشے کچھ اسطرح لگائے گئے ہیں، کہ ان کا رخ ہمیشہ آفتاب ہی کی طرف
رہتا ہے، اگرچہ بعض اونچے اونچے درختوں کے سایہ کی وجہ سے اس چولھے پر دن میں صرف سات ہی گھنٹے آفتاب کی
روشنی پڑتی ہے، تاہم اسی مدت میں یہ اتنا گرم ہو جاتا ہے کہ رات میں بھی اسکی حرارت نقطۂ جوش (Boiling Point)
سے اوپر رہتی ہے، اور آسانی کیساتھ اسکے تنور میں روٹی پکائی جا سکتی ہے،

لیکن ڈاکٹر ایبٹ کا یہ تجربہ اپنی قسم کا پہلا تجربہ نہیں ہے، یہ بات غالباً عام طور پر معلوم نہیں ہے کہ اب سے
دو ہزار سال پہلے بھی آفتاب کی کرنوں سے آگ کا کام لیا جاتا تھا، قدیم روما کے معبد وستا (Temple of Vesta)
میں مقدس آگ آفتاب ہی کی کرنوں سے روشن کیجاتی تھی، خشک لکڑی کے ایک ٹکڑے پر کسی دھات کا ایک عاکس
(Reflector) رکھکر آفتاب کی کرنیں اسکے ماسکہ پر لاتے تھے، اور ان کرنوں کی حرارت سے آگ پیدا کرتے تھے

زمانہ حال میں بھی دنیا کے مختلف حصوں میں ماہرین سائنس آفتاب کی قوت سے مختلف کام لینے کی کوشش
کرتے ہیں، مثلاً سوویٹ حکومت تاشقند میں تجربہ کر رہی ہے، کہ آفتاب کی روشنی سے پانی گرم کرنے کا کام لیا جائے

اور وہ اس تجربہ میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوگئی ہے،

آفتاب کی کرنوں سے آگ پیدا کرنے کا تجربہ ۱۷۴۷ء میں فرانس کے ممتاز سائنسدان بفن (بوفون) نے بھی کیا تھا، اُس نے ایک چوکھٹے میں تین سو آئینے اسطرح لگائے تھے، کہ جب ان پر آفتاب کی کرنیں پڑیں تو ان کے عکس کی حرارت سے خشک لکڑیوں کے ایک گٹھے میں جو دو سو فٹ کے فاصلے پر رکھا ہوا تھا آگ لگ گئی، اور چاندی کا ایک ٹکڑا تقریباً بیس فٹ کے فاصلے پر پگھل گیا، بفن کے اس تجربہ کی بنیاد پر رصد خانہ ماؤنٹ ولسن کے ڈاکٹر جارج ہیل (George Hale) نے ایک آلہ تیار کیا ہے، جسمیں تیس قوی محدب شیشے لگے ہوئے ہیں، یہ آلہ چھ سو درجہ کا ٹمپریچر پیدا کرتا ہے، اور فولاد کے تار کو مکھن کی طرح گلا دیتا ہے"،

آجکل فرانس کا ایک شخص جیکیس آرتھائیز (Jacques Arthuys) نامی بھی سورج کی کرنوں پر قابو حاصل کرنے کیلئے اپنا سارا وقت اور تمام دولت صرف کر رہا ہے، چند سال ہوئے اوس نے ایک ایسا آلہ بنایا تھا جس کے آئینوں سے آفتاب کا عکس مکان کے ہر گوشہ میں ڈالا جا سکتا ہے، اس آلہ کی خصوصیت یہ ہے کہ غروب کے بعد یا دن میں جب آفتاب ابر یا کسی دوسری وجہ سے چھپ جائے، تو خود بخود ایک پرزہ کو حرکت ہوتی ہے، اور فوراً ہی بجلی کی روشنی ہو جاتی ہے، اس سے دو لاکھ بتی طاقت کی روشنی حاصل ہو سکتی ہے اور ۹ ہزار مربع میل کا رقبہ روشن کیا جا سکتا ہے، باوجود اس کے قیمت صرف چھ سو پونڈ ہے، اور بڑی بات یہ ہے کہ روزانہ مصارف کچھ بھی نہیں،

جانوروں میں فہم

رسالہ میلبورن ہرلڈ کے ایک مقالہ سے جانوروں کی فہم کی نسبت بعض دلچسپ معلومات حاصل ہوئے ہیں مسٹر وکی (A. A. Wickie) نے جو عجائب خانہ ملبورن (آسٹریلیا) کے ڈائرکٹر ہیں، جانوروں کی قوت حافظہ، محبت اور عداوت کے متعلق بہت سے قصے بیان کئے ہیں، موصوف کا خیال ہے کہ تمام جانوروں میں بندر سب سے زیادہ ذہین ہوتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ سماترا کی طرف کا ایک بندر جسے اورنگ اوٹنگ

کہتے ہیں جب انھیں عورتوں سے باتیں کرتا ہوا دیکھتا، تو اکثر شدید حسد کے جذبات ظاہر کرتا، چنانچہ ایک مرتبہ اوس نے ایسے ہی موقع پر ایک لڑکی پر تھوک بھی دیا، عجائب خانہ کے ہاتھی بھی اپنی روایتی وفاداری اور ذہن کے اوصاف کا ثبوت برابر دیتے رہتے ہیں، ایک ہاتھی تو یہاں تک کرتا تھا، کہ جب اوس کا دماوت تھوڑی دیر کیلئے سبزہ پر سو جاتا تو وہ اسکے قریب کھڑا ہو کر اپنی سونڈ سے مکھیاں اوڑایا کرتا تھا،

مقالہ نگار کا بیان ہے کہ سائنسدانوں نے جانوروں کے فہم کی تحقیق نہایت تفصیل کیساتھ کر کے مختلف جانوروں کو ان کی فہم و ادراک کے لحاظ سے حسب ذیل ترتیب میں رکھا ہے:-

(۱) شمپانزی یعنی افریقہ کا بڑا بندر جو شکل میں انسان سے مشابہ ہوتا ہے، (۲) اورنگ اوٹنگ یہ بھی انسان سے مشابہ ہوتا ہے، اور بورنیو اور سماترا کے جنگلوں میں پایا جاتا ہے، (۳) ہاتھی، (۴) گوریلا، افریقہ کا قوی جثہ اور خوفناک بندر، (۵) پالو کتا، (۶) اود بلاؤ (۷) گھوڑا، (۸) ماہی شیر، (۹) ریچھ، (۱۰) پالو بلی،

اس تحقیق کے سلسلہ میں سائنسدانوں نے جانوروں کی جانچ مندرجہ ذیل باتوں میں کی تھی:-

جدت فکر، قوت ادراک، تربیت قبول کرنے اور معلومات حاصل کرنے کی استعداد، قوت حافظہ، تقلید یا نقالی ذکاوت اور موقع کی سوجھ، اپنے کو ماحول کا خوگر بنا لینا، وغیرہ وغیرہ،

بعض جانور ایسے ہیں، مثلاً بڑے بندر جو ماحول کا مقابلہ کرنے میں انسان سے زیادہ ذہانت کا ثبوت دیتے ہیں، بعض ایسی قوتوں کے مالک ہیں، جو انسان کے احاطۂ قدرت سے باہر ہیں، مثلاً کتے کی قوت شامہ انسانوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوتی ہے اور اس قوت کے ساتھ ساتھ کتا غیر معمولی طور پر ذہین بھی ہوتا ہے، شہد کی مکھی الٹرا وایولٹ (ultraviolet) شعاعوں کو دیکھ سکتی ہے، درانحالیکہ انسان کی آنکھیں اسکے دیکھنے سے بالکل قاصر ہیں، سانپ کی عجیب و غریب زبان اعصاب حواس سے ملی ہوئی ہے، جسکے ذریعہ وہ معلوم کر لیتا ہے کہ اسکا شکار کیا چیز ہے اور دور ہی سے اس کا مزہ بھی چکھ لیتا ہے،

ٹرائے کے آثار قدیمہ

برسوں کی محنت کے بعد ماہرین اثریات نے ٹرائے (Troy) کے آثار قدیمہ کھود کر نکالے ہیں، یہ

خطۂ ایشیائے کوچک کے شمال مغرب میں واقع ہے، آثار کی تحقیق سے معلوم ہوا ہے، کہ اس کا تمدن زمانۂ
جدیدہ سے شروع ہوا تھا، خاص ٹرائے ہسارلک (Hissarlik) نامی ایک پہاڑی پر آباد تھا،
جرمنی کے ادارۂ آثار قدیمہ نے جس نے کھودائی کا سلسلہ ۱۸۷۲ء میں شروع کر دیا تھا، یہ دریافت کر لیا ہو کہ
کی پہاڑی پر صرف ایک ہی نہیں بلکہ یکے بعد دیگرے نو شہر آباد ہوئے، اور ان سب کے کھنڈر ایک کے نیچے ایک دبے
پڑے ہیں، کھنڈروں کی ان تہوں میں سے چھٹی تہ اس ٹرائے کی معلوم ہوتی ہے، جسکا گیت ہومر نے گایا ہے، گذشتہ
سال اسکی سطح صاف کی گئی جس سے معلوم ہوا کہ یہ حصہ آتشزدگی سے برباد ہو گیا تھا، کھودائی کے سلسلہ میں ان چیزوں
کی تلاش پر زیادہ توجہ رکھی گئی ہے جو ٹرائے کے باہر کی تھیں، کیونکہ جیسا کہ ڈاکٹر بلجن (Dr. Blegen)
کا خیال ہے، ٹرائے اپنے رتبہ، ثروت، تہذیب و تمدن اور موقع کے لحاظ سے ضرور تجارت کا ایک بڑا مرکز
رہا ہوگا، چنانچہ ایسی متعدد چیزیں برآمد کی گئی ہیں، مثلاً مائیسینین (Mycenean) وضع کے کئی
کے چند برتن ایک مرصع آبخورہ، اور انیس سالم اور چند ٹوٹے ہوئے ظروف جنمیں مردوں کی راکھ رکھی جاتی تھی
ان ظروف سے قیاس ہوتا ہے کہ وہاں مردے جلائے جاتے تھے،

روشنی میں اندھیر

تہذیبِ جدید کے چشم و چراغ امریکہ کی "مجلس تحقیق جرائم" (American National Crime Commission)
کا بیان ہے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ہر سال بارہ[12] ہزار قتل، تین ہزار بچوں اور بڑوں کو جبراً غائب کر دینے کے
واقعات، پچاس ہزار ڈاکے، پانچ ہزار آتش زدگی کی وارداتیں، ایک لاکھ مار پیٹ کے جرائم اور چار[4] ہزار نقب زنی
کے سرزد ہوتے ہیں، ان جرائم کے انسداد پر جو رقم صرف کیجاتی ہے، اس کا سالانہ اوسط مجلسِ مذکور کے بیان کے
مطابق قومی قرضہ کا تقریباً نصف اور اس قرضۂ جنگ سے زیادہ ہے، جو یورپ کے ذمہ امریکہ کے حق میں واجب الادا
تھا، اور جواب ڈوب چکا ہے، یہ بھی بیان کیا گیا ہے، کہ امریکہ میں مجرموں کی تعداد کم سے کم دس لاکھ ہے،

"ع ز"

ادبیات

تابشِ سہیل

از جناب اقبال احمد صاحب سہیل، ایم اے (علیگ) ایڈووکیٹ اعظم گڈھ

اب ضبطِ شوق کا متحمل نہیں رہا، دل جلوہ گاہِ حُسن کے قابل نہیں رہا،
وہ اضطرابِ بال و پرِ دل نہیں رہا مشکل یہ ہے کہ عقدۂ مشکل نہیں رہا،
نظارہ بھی نظر کے مقابل نہیں رہا اب حُسن و عشق میں کوئی حائل نہیں رہا،
نذرِ حریمِ حُسن کے قابل نہیں رہا لائے تھے تیری بزم سے جو دل نہیں رہا
پاسِ ادب سے کر نہ سکا شرحِ آرزو، میں بیخودی میں بھی کبھی غافل نہیں رہا
نکلے تو ہیں، جنوں میں مگر کیا کریں گے ہائے کانٹا اگر کوئی سرِ منزل نہیں رہا
حُسنِ خزاں کی دیکھنے والی نظر کہاں گزری بہار، شورِ عنادل نہیں رہا
رقصاں سرِ شہید کہ پائی حیاتِ نو تیغِ ستم کو ناز، کہ بسمل نہیں رہا،
اب تک ہوائے نجد جنوں خیز ہے، مگر، مجنوں سا کوئی جوہرِ قابل نہیں رہا،
اب بھی دلوں میں جوشِ جنون برقرار ہے زنداں میں گرچہ شورِ سلاسل نہیں رہا
تقلیدِ وضعِ جامہ دری عام ہو گئی اب تو جنوں بھی مشق کے قابل نہیں رہا
چھایا ہوا ہے، دیدہ و دل پر جمالِ حق باطل بھی اب نگاہ میں باطل نہیں رہا
جوشِ بہار خونِ شہیدانِ شبابِ حسن ڈھونڈھا کہاں نظر نے کہ تو مل نہیں رہا

اب بھی دلِ حزیں سے تغافل شعاریاں ‏ ‏ اب یہ تری نظر سے مرادِ دل نہیں رہا

خونِ شہید ہے چمن آرائے صد حیات ‏ ‏ دھوکے میں ہیں جو کہتے ہیں، بسمل نہیں رہا

کس کا کمال جلوہ فگن ہے کہ اے سہیل

خود تو بھی اب نگاہ میں کامل نہیں رہا

رُباعی

پچھلے پہر اوٹھ کے شب کو رو لیتے ہیں، ‏ ‏ ہر داغ کو معصیت کے دھو لیتے ہیں،

کیا تابشِ حشر سے ڈریں تر دامن ‏ ‏ ہر روز یہ دامن کو بھگو لیتے ہیں،

نذرِ مومن

پروفیسر رگھوپتی فراق، ایم اے، الہ آباد یونیورسٹی،

نہ تو حیراں وہ ہوئے ہیں نہ وہ حیراں ہونگے، ‏ ‏ آئینے خود عرق آلود و پشیماں ہوں گے

جانیں کیا ہوں گے جو بڑھ جائینگے عشاق کے دل ‏ ‏ چھوٹے ہوں گے تو یہ طولِ شبِ ہجراں ہوں گے

انتشارِ دلِ وارفتہ نہ مٹ جائے کہ ہم، ‏ ‏ اور جمعیتِ خاطر سے پریشاں ہوں گے

نگہِ ناز جو تجھ میں ہیں یہ اندازِ حیا، ‏ ‏ یہی اک دن ترے چلتے ہوئے پیکاں ہوں گے

عشق میں وصل کے معنی ہی نہیں کچھ یوں تو ‏ ‏ ہوں گے جو وعدۂ دیدار سے شاداں ہوں گے

یوں تو ممنوں ہیں لیکن ترے غم کشتوں میں ‏ ‏ اب رہا کیا جو ترے لطف کے خواہاں ہوں گے

ہم بھی کچھ قیس و فرہاد سے واقف ہیں مگر ‏ ‏ اتنے بیتاب نہ ڈاے غمِ ہجراں ہوں گے

جاں نثاروں کو ترے کب یہ خبر تھی کہ تجھے ‏ ‏ دل سے چاہیں گے نہ چاہیں گے پشیماں ہوں گے،

یہ تو تمہیدِ کرم ہے، دلِ خوں گشتہ ابھی، ‏ ‏ دیکھ کیا کیا نگہِ یار کے احساں ہوں گے

خوفِ ظلمات نہیں بادہ کشوں کو ساقی ‏ ‏ یہ جہاں جائیں گے، خود بزم چراغاں ہوں گے

ایک آئے گی نظر اصلیتِ غیب و شہود ‏ ‏ دونوں عالم ترے دیدار میں یکساں ہوں گے

لاکھ ہوں بے سر و ساماں مگر اے ذوقِ فنا ‏ ‏ ہم جو باقی ہیں تو کیا بے سر و ساماں ہوں گے

جلوۂ صبحِ ازل تیرگیٔ شامِ ابد، ‏ ‏ یہی گیسوئے پریشاں رخ تاباں ہوں گے،

ہے دلوں کی جو یہی حالتِ امید و بیم ‏ ‏ نہ یہ آبادی ہوں گے نہ یہ ویراں ہوں گے

یہ تجاہل یہ تبسم، یہ حیا کے انداز ‏ ‏ یہ تو کیا اٹھتی جوانی کے نگہباں ہوں گے

شرم کے نام سے ہر آنکھ چرانا منظور ‏ ‏ یہ ادا اور علاجِ غمِ پنہاں ہوں گے!!

دیر ہے اذنِ جنوں پانے کی دیوانوں کو ‏ ‏ پھر نہ زنداں نہ گلستاں نہ بیاباں ہوں گے

اسکے وعدے جو ہوں پورے تو قیامت ہو فراق

نہ ہوں پورے تو ڈطولِ شبِ ہجراں ہونگے

سخنِ ماہر

از مولوی منظور حسین صاحب ماہر القادری، حیدرآباد دکن،

وہی کچھ دہر میں رازِ نظامِ دل سمجھتے ہیں ‏ ‏ جو تیرے عشق کو کونین کا حاصل سمجھتے ہیں،

ہمیں دیر و حرم کی سمت جانیکی ضرورت کیا؟ ‏ ‏ کہ ہم ایک ایک ذرہ کو تری منزل سمجھتے ہیں،

مری جانب کبھی بھولے سے بھی نظریں نہیں اٹھتیں ‏ ‏ وہ مجھکو التفاتِ خاص کے قابل سمجھتے ہیں،

ملا ہم کو صلہ یہ بحرِ غم کی آشنائی کا ‏ ‏ جسے طوفاں سمجھتے تھے اسکو ساحل سمجھتے ہیں

کہاں یہ ناتواں دل اور کہاں وہ جوبنِ پنہاں ‏ ‏ یہ اُن کی مہربانی ہے جو اس قابل سمجھتے ہیں،

محبت پر مدارِ ہستیٔ کونین ہے ماہر

یہ وہ نکتہ ہے جسکو صاحبانِ دل سمجھتے ہیں

مطبوعات جدیدہ

زندگی،- از جناب چودھری فضل حق صاحب ام ال سی (پنجاب) ناشر جناب محمد نعیم ہمایوں، بی اے، قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور، ۳۴۰ صفحے قیمت ۸ر

یہ ایک افسانہ ہے، جسمیں انسانی زندگی کے روشن اور تاریک پہلو دکھائے گئے ہیں، افسانہ کا ہیرو لنکرا ملک کا ایک معزز، نیک، اور پارسا عہدہ دار ہے، اس کے گرد گناہوں کی ترغیب کے سامان جمع ہوئے، وہ اپنے ضمیر کی کشمکش کے بعد غیر محسوس طریقہ سے گناہوں کی آلودگیوں میں پڑ گیا، اور عیش و عشرت اور فسق و فجور کی ہر منزل سے گذرا، اور جب اس راہ میں اپنی دولت، عزت، اخلاق، اور انسانیت لٹا چکا تو اسکی آنکھیں کھلیں اور اپنے گناہوں کے داغ اپنے حسن عمل سے دھونا چاہے، اور پھر عالم رویا میں عالم مثال و عالم ارواح کا نظارہ کیا، اور عذاب قبر، حشر و قیامت تک کے تمام مرحلے اسکے سامنے سے گذرے، عالم مثال میں نیکی و بدی کے تمثالی شکلیں دیکھیں، پھر مختلف اخلاق، اطوار، عادات، خصائل، اور پیشہ کے مردوں اور عورتوں سے عالم بالا کے "سنٹوریم" دار الاصلاح میں ملاقاتیں ہوئیں، ان سے انکی دنیاوی سرگذشت الگ الگ سنی، پھر قبر کی پہلی منزل عالم بالا کی عدالت میں پہلی پیشی اور دار الاصلاح میں بھیجے جانے، اور دنیا کے گناہوں کی آلائشوں کے دور کرنے کے طریقے سنے، اسکے بعد اصلاح پائی ہوئی روحوں کے حشر کا دن آتا ہے، اور ایک وقت مقررہ پر بہشت میں داخل ہوتی ہیں، اس سارے بیان میں عالم بالا کی ایسی تصویر کی ہے، کہ عالم بالا اور قیامت کا پورا نقشہ نگاہوں میں گھوم جاتا ہے،

مصنف نے یہ افسانہ اپنے ایام اسیری میں گورکھپور جیل میں بیٹھ کر لکھا ہے، اس کا ماخذ اسلامی روایات ہیں جنمیں قیامت کا حال بیان کیا گیا ہے، انہیں تصوروں میں رنگ کر مصنف نے اپنے تخیل کی مدد سے ایسا سماں کھینچا ہے، کہ اصل کی جھلک نظر آنے لگی ہے، تصنیف کا اصل مقصد یہ دکھانا ہے، کہ انسانی زندگی خلق کی خدمت، اور باطنی اور ظاہری پاکیزگی

اور صفائی کا نام ہے، معمولی مسامحات کو نظرانداز کر کے تحریر کا ادبی معیار بھی خاصہ بلند، زبان بامحاورہ اور بے تکلف اور انداز بیان شگفتہ ہے، اردو میں ایسی اخلاقی و اصلاحی کتابیں اس معیار کی بہت کم لکھی گئی ہیں، اور خوشی ہوئی کہ ملک میں اوس کی قدردانی بھی کی گئی، حکومت پنجاب نے علم پروری کا ثبوت دیا، اور پبلک نے بھی کتاب کا پہلا اڈیشن ہاتھوں ہاتھ لے لیا،

آغاز ہستی، ترجمہ جناب مجنون گورکھپوری ۹۴ صفحات، تقطیع چھوٹی، لکھائی چھپائی، اور کاغذ عمدہ قیمت مجلد عہ بغیر محصول و غیر مجلد مع محصول، ناشر ایوان اشاعت گورکھپور،

یہ برناڈشا کے ایک ڈرامہ کا اردو ترجمہ ہے، اسمیں مصنف نے انسان کی خلقت کے بعد انسانی زندگی کا آغاز دکھایا ہے، اس ضمن میں زندگی، موت اور خیر و شر کے مسائل پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے، ابوالبشر کے دل میں مختلف خیالات و جذبات پہلی مرتبہ آتے ہیں، اور اون میں وہ اپنی مونس زندگی ام البشر سے صلاح و مشورہ لیتے ہیں، اور باغ عدن کا سانپ ان دونوں کی عقلی رہنمائی کرتا ہے، انہی گفتگوؤں میں مختلف مفہوم و معانی کے ادا کرنے کیلئے پہلی مرتبہ مختلف الفاظ متعین کئے جاتے ہیں، اسی سلسلہ میں فنا و بقا کی بحثیں چھڑتی ہیں، اور انسانی نسل کے باقی رہنے کا خیال پیدا ہوتا ہے، پھر ابوالبشر اور ام البشر باغ عدن سے سطح زمین پر آتے ہیں، اور دونوں کھیتی کرتے اور چرخہ کاتتے نظر آتے ہیں، اور دوسری طرف ان کی اولاد میں سے قابیل دوسروں پر موت طاری کرنے کا فن سیکھ لیتا ہے، اور یہ نظریہ قائم ہوتا ہے کہ دنیا میں صرف طاقتوروں اور فتحیابوں کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے، حضرت ابوالبشر اس نظریہ کو عمل میں لانے سے روکنا چاہتے ہیں، مگر ناکام رہتے ہیں، ڈرامہ میں عورت مرد، بیوی شوہر، اور ساس بہو کے تعلقات و جذبات کی طرف بھی لطیف اشارے کئے گئے ہیں، ڈرامے کا ترجمہ کامیابی کے ساتھ کیا گیا ہے،

قربانی،- از جناب پنڈت کشن پرشاد صاحب کول، ۹۴ صفحے، تقطیع چھوٹی، قیمت ۸ر، پتہ منیجر لیڈر پریس الہ آباد،

جناب پنڈت کشن پرشاد صاحب کول مفید معاشرتی اصلاحی ڈرامے لکھتے رہتے ہیں، یہ نیا ڈرامہ بدھوا بیاہ یعنی عقد بیوگان کی حمایت میں لکھا گیا ہے، جسمیں ایک نوجوان بیوہ کی مصیبت پھر اس کا بدھوا آشرم میں داخل ہونا

اور آشرم کے بانی سے شادی ہوجانا دکھایا ہے، ڈرامہ اثرانگیز ہے،

پنڈت جی کی اردو تحریر شگفتہ ہوتی ہے، اور وہ اس زبان کے اچھے ادیبوں میں ہیں، مگر ادھر چند سال سے سنسکرت کے نامانوس لفظ ان کی تحریر میں داخل ہوگئے ہیں، چند سال گذرے معارف نے انھیں اسطرف متوجہ کیا تھا، گر ہوں نے اسکے جواب میں اپنے کسی مضمون میں فرمایا تھا، کہ چونکہ وہ اپنی تصنیفات میں ہندو سوسائٹی اور معاشرت کا نقشہ کھینچتے ہیں، اسلئے سنسکرت لفظوں کا استعمال صحیح ہے، لیکن یہ ارشاد اسوقت ایک حدتک صحیح ہوتا جب ہندوؤں کا کوئی بھی تمدنی و مذہبی مفہوم ان الفاظ میں ادا کیا جاتا، لیکن اب تو وہ عام جذبات و خیالات کے ادا کرنے میں بھی اس قسم کے نامانوس لفظ استعمال کرنے لگے ہیں، اس ڈرامہ میں بھی ایسے سنسکرت یا ہندی لفظ آئے ہیں، جن کے معنی شاید بہت کم اردو داں لوگوں کو معلوم ہوں گے، مثلاً "پراو پکار" "پراشچست" "شنکشا"، "دکھشنا" "تجھ" "ایمان" "نزانکار" "جوتی سروپ" "سردشکنی" "مورکھ" وغیرہ،

رموزِ کلامِ غالب، از جناب محمد اسحاق صاحب امرتسری ۸۲ صفحے، تقطیع چھوٹی، قیمت ۸ر، پتہ منیجر مادر تمام آرٹ پریس نمبر ۸۰ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ،

مولف نے غالب کے چند اشعار کی تشریح اپنے جذباتی تخیلات کی روشنی میں کی ہے، موصوف کا خیال ہو کہ "یہ روشنی کلام غالب پر غور و فکر کی نئی راہیں کھول دیگی"۔

مثنوی مذہب و عقل اور **مثنوی معاش و معاد** } از مولانا تمنا عمادی پھلواروی، حجم بہ ترتیب ۳۲، ۱۰۰ صفحات تقطیع چھوٹی، پتہ جناب سید محمد امام الدین صاحب فائق مجیبی، پھلواری شریف ضلع پٹنہ

مولانا تمنا عمادی پھلواروی صوبہ بہار کے ممتاز شاعر اور صاحب علم ہیں، موصوف نے فارسی زبان میں دو مثنویاں لکھی ہیں، پہلی مثنوی مذہب و عقل کے موازنہ و مناظرہ میں ہے، اور دوسری میں انسانوں کی پیدایش سے موت تک کے مراتب اور پھر آیندہ زندگی کو قرآن مجید کی روشنی میں بیان کیا ہو، مادیین اور اہل تناسخ کے عقائد کی تردید کی ہے، اور اسلامی عقائد ثابت کئے ہیں، گفتگو کے اثنا میں موجودہ زمانہ کے مختلف متکلمانہ مسائل آئے ہیں اور ان پر قرآن مجید کی آیتوں سے دلائل و شواہد پیش کئے ہیں، یہ مثنویاں اپنی زبان کی شیرینی، نظم کی لطافت، طریق ادا

کی دلکشی اور معانی کی بلندی کے لحاظ سے داد کے قابل ہیں، امید ہے کہ اہل نظر کے درمیان دلچسپی اور ذوق سے پڑھی جائیں گی، پہلی مثنوی پر ڈاکٹر سر اقبال، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا آزاد سبحانی اور ڈاکٹر ظفر الحسن پروفیسر فلسفہ مسلم یونیورسٹی کی رائیں ثبت ہیں، اور دوسری مثنوی پر مولانا ابوالکلام آزاد نے چند سطریں لکھی ہیں،

فیض المنّان فی معارف القرآن:۔ از جناب شیخ غلام حیدر صاحب سابق ہیڈ ماسٹر سرگودھا پنجاب، ۱۱۲ صفحے، قیمت عہ

یہ چند خطبات کا مجموعہ ہے، اس میں قرآن مجید کے اعجاز اور اسلامی احکام و تعلیمات کے اسرار بیان کئے گئے ہیں، بعض خطبوں میں منکرین حدیث کے مزعومہ عقائد کی تردید کی گئی ہے، اور بعض میں عذاب قبر و یوم آخرت وغیرہ کے ثبوت قرآن مجید سے فراہم کئے گئے ہیں، مصنف نے مسائل پر غور و فکر سے نظر ڈالی ہو، اور دلنشین اسلوب میں بیان کیا ہو، رسالہ کا مطالعہ مفید ہوگا،

الکوکب الدری، (عربی مجلد اول) از حضرت مولینا رشید احمد گنگوہیؒ، ۴۴۴ صفحات تقطیع $\frac{۲۲}{۲۲}$۸، قیمت مجلد للعمر غیر مجلدے ر، پتہ، کتبخانہ یحیوی، مظاہر علوم، سہارنپور،

یہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رح کے درس ترمذی کی تقریر کا مجموعہ ہے، جسکو مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندہلوی نے قلمبند کیا تھا، اور اسوقت تک یہ قلمی صورت میں تھا، مولانا محمد زکریا صاحب محدث مدرسہ مظاہر علوم نے اپنے حواشی کیساتھ شائع کرکے دینی خدمت انجام دی ہے، ہر صفحہ کے اوپر کے حصہ میں ترمذی کی شرح اور نیچے کے حصہ میں اسکے حواشی درج ہیں، امید ہو کہ اہل علم میں اسے اسکے شایان شان قبولیت عام حاصل ہوگی،

تعلیمُ الہُدیٰ، از مولوی محمد حسن صاحب قادری، مدرس مدرسہ انوریہ، شاہی مسجد لودھیانہ، ۱۸۰ صفحے، قیمت :-۸ر

یہ طلبہ کیلئے دینی مسائل پر مختصر اور کارآمد رسالہ ہے، پہلے اسلامی عقائد میں توحید، صفات باری تعالیٰ، اور رسالت کا ذکر ہے، پھر صحابہ کرام، محدثین، ائمہ، اور فقہاء کا ذکر آیا ہے، پھر عبادات اور ان کے ارکان کا علٰحدہ علٰحدہ

بیان ہو، رسالہ کا نمایاں امتیاز اسکی ترتیب ہو، اگرچہ یہ فقہی مسائل ہی کے بیان میں ہو، مگر مصنف نے محنت سے ہر
کے متعلق پہلے قرآن مجید کی اگر آیتیں ہیں، تو مع ترجمہ ان میں درج کی ہیں، پھر حدیثیں مع ترجمہ لکھی ہیں، اگر انہی
آیات واحادیث سے مسئلہ کا مفہوم واضح ہو گیا ہے تو انہی پر اکتفا کیا ہے، ورنہ مسئلہ کی تشریح کر دی ہے، اس
سے رسالہ کی افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے، ہمارے خیال میں دینیات پر بچوں کیلئے جو رسالے لکھے گئے ہیں، ان میں
رسالہ کو نمایاں جگہ حاصل ہے، اور اردو اور انگریزی مدرسوں کے دینیات کے درجوں میں داخل ہونے کے لائق ہے،

شانِ قرآن، از مولوی عبدالحکیم صاحب ناظم، صدیقی در بھنگوی، اڈیٹر رسالہ محدث، دار الحدیث
رحمانیہ، دہلی، ۸۰ صفحے، قیمت مع محصول ۶ر

یہ فرید وجدی کی دائرۃ المعارف کے مضمون "قرآن" کا اردو ترجمہ ہے، اسمیں قرآن مجید کے نزول، کتابت
اور تدوین کی تاریخ لکھنے کے بعد اس کے اعجاز کے وجوہ دکھائے ہیں، پھر قرآن مجید کے پیش کردہ عقائد و تعلیمات کو
پیش کیا ہے، ترجمہ میں سلاست و روانی موجود ہے،

مطلع الانوار، از مولانا مفتی رکن الدین صاحب مرحوم، ۸۰ صفحے، قیمت ۲ر، پتہ مکتبہ قاسمی نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن،
مولانا محمد انوار اللہ خاں صاحب فضیلت جنگ مرحوم نے حیدرآباد کے دورِ آخر میں بہت کچھ علمی و دینی خدمات
انجام دیں، موصوف مدرسہ نظامیہ حیدرآباد، اور علمی مجلس، مجلس اشاعۃ العلوم، اور دائرۃ المعارف النظامیہ کے بانی
میں تھے، اور اعلیٰحضرت میر محبوب علی خان خلد مکان اعلیٰحضرت حضور نظام آصف جاہ سابع، اور اعلیٰحضرت کے شاہزادگان
والا تبار کے اساتذہ میں تھے، یہ رسالہ ان کے سوانح حیات اور انکے علمی و دینی خدمات کے بیان میں ہے،

النشر العاطر بمولد الشیخ عبد القادر، مترجمہ مولوی صبغۃ اللہ صاحب شہید انصاری فرنگی محلی،
حجم ۱۹ صفحے مطبع اشاعۃ الاسلام، فرنگی محل لکھنؤ،

شیخ عبد القادر گیلانی رح کے مختصر حالاتِ زندگی میں شیخ احمد جمال الدین تونسی کا ایک رسالہ عربی زبان
میں تھا، اسکا اردو ترجمہ مولوی صبغۃ اللہ صاحب شہید نے عقیدت کیساتھ کیا ہے،

دین و دولت، از مولوی عبد الباری نور الحسن صاحب بخاری، ۵۰ صفحے، قیمت ۲ر، پتہ انجمن
اسلامیہ سکھانے والا، ڈیرہ غازی خان پنجاب،

اس رسالہ میں دکھایا گیا ہے، کہ افلاس انسانوں کیلئے بدترین لعنت ہے، اسلام نے دولت کے حاصل
کرنے کی ممانعت نہیں کی، بلکہ چند حدود قائم کئے کہ ان میں رہکر مسلمان دولت سے بہرہ اندوز ہوں، مصنف نے
ان حدود کی بھی تشریح کی ہے، پھر اسلامی عہد کی دولت کی فراوانی کا نقشہ دکھایا ہے، اور آخر میں بتایا ہے کہ
مسلمانوں کو دولت کے حصول کے ذرائع صنعت، حرفت، تجارت، اور زراعت میں حصہ لینا چاہئے، رسالہ پر علمائے
دیوبند کی تصدیقیں ثبت ہیں،

مجموعہ رسائلِ حج، از مولوی عبد الوہاب صاحب دہلوی مقیم مکہ معظمہ، پتہ کوٹھی حاجی علی جان
صاحب مرحوم، نئی سڑک دہلی،

یہ چند رسائل، "اسرارِ حج" (۳۰ صفحے) "حجِ نبوی" (۲۳ صفحے) اور "ادعیۂ حج" (۴۴ صفحے) کا مجموعہ ہے، پہلے
رسالہ میں اولاً حج کی فرضیت اور اس کے ارکان و مسائل لکھے ہیں، پھر حج ادا کرنے کا مفصل طریقہ درج ہے،
اس کے بعد حج کے فضائل و فوائد و اسرار بیان کئے گئے ہیں، دوسرے رسالہ میں آنحضرت صلعم کے حج ادا فرمانے
کے حالات ہیں، اور تیسرے رسالہ میں حج کی ماثور دعائیں جمع کی گئی ہیں، یہ مجموعہ نفیس کاغذ پر عمدہ لکھائی چھپائی
کے ساتھ چھپا ہے، اور رفاہِ عام کے لئے مفت شائع کیا گیا ہے، محصول بھیجکر یا بیرنگ بھیجنے کی اجازت دیکر
طلب کیا جا سکتا ہے،

صلوٰۃ الاطفال:۔ از مولوی عبد الرحمٰن صاحب بھوپال، پتہ، منیجر قومی کتبخانہ تجارتی،
بھوپال، قیمت ۱ر

اسمیں نماز ادا کرنے کے طریقے اور اسکی دعائیں بچوں کیلئے لکھی گئی ہیں،

طبِ یونانی، از جناب نیر واسطی، ۱۶۰ صفحے، تقطیع چھوٹی، قیمت ۱۲ر، پتہ دیسی دواخانہ، چونی منڈی، لاہور،

اس رسالہ میں یونانی طب اور یونان کے حکماء قدیم کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے،

اسلام کیا ہے، ازجناب خاں صاحب محمد منظور الٰہی، ۱۴۴ صفحے، قیمت ۴ر پتہ:۔ منیجر دار الکتب احمدیہ بلڈنگس، لاہور،

اسمیں اسلامی عقائد و اخلاقی تعلیمات سوال وجواب کے ذریعہ بیان کئے گئے ہیں، جوابوں میں جا بجا قادیانیوں کے فرقہ احمدیہ کے خیالات کی جھلک نمایاں ہے،

کارنامۂ حسینؑ، ناشر اسلامی پریس گورہٹہ پٹنہ سٹی، حجم ۵۶ صفحے،

صوبہ بہار کی شیعہ کانفرنس نے محرم کے موقع پر ملک کے مختلف مشاہیر سے سانحۂ کربلا پر اون کے تاثرات قلمبند کرا کر منگائے تھے، اونہی کا مجموعہ کارنامۂ حسین کے نام سے شائع ہوا ہے، اس میں نظم و نثر دونوں قسم کے جذباتی مضامین ہیں،

توحید، ازجناب قاری سرفراز حسین دہلوی مرحوم، قاری بکڈپو، ٹیامحل، دہلی، ۱۴۴ صفحات، قیمت ۸ر

قاضی سرفراز حسین مرحوم دہلوی کو آخری عمر میں مسلمانوں کے جدید علم کلام کی تدوین کی ضرورت کا احساس ہوا تھا، اسی ذیل میں انھوں نے نمونہ کے طور پر اسلامی عقائد پر رسالے لکھے تھے، ان میں کا ایک رسالہ توحید ہے، اس میں مسلمانوں کے عقیدۂ توحید علم کلام میں اس عقیدہ کے دلائل، اور دنیا میں اس عقیدہ کے پھیلنے کے اثرات دکھائے ہیں،

آسان قواعد اردو، از مولوی قاضی خلیل احمد صاحب صدیقی خطیب ریاست جونا گڈھ، کنگ روڈ جونا گڈھ، کاٹھیاوار، ۱۲۱ صفحے، تقطیع چھوٹی، قیمت: ۔۹ر

یہ رسالہ اردو زبان کی صرف ونحو کے قواعد میں ہے، قواعد سہل اور آسان زبان میں لکھے گئے ہیں، اردو کی اصطلاحوں کے سامنے انگریزی زبان کی نحوی وصرفی اصطلاحیں درج کی گئی ہیں، کہ انگریزی اسکولوں کے طلبہ اُن سے زیادہ مانوس ہوتے ہیں، اور ہر سبق کیساتھ تھوڑی مشقیں درج ہیں، کتاب کاٹھیاوار کے بعض اسکولوں میں داخل ہے، اور طلبہ کیلئے مفید ثابت ہوئی ہے،

"ض"

جلد ۳۵ | ماہ ذی الحجہ ۱۳۵۳ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۳۵ء | عدد ۴

مضامین

———·———